ماہتاک کوئٹہ

سنگت

APRIL 2024

Reg No. DCS-6 مسلسل ماہانہ اشاعت کا 27 واں سال

ماہتاک کوئٹہ

سنگت

Vol.27
APRIL 2024
NO.05

ایڈیٹر

شاہ محمد مری

پرنٹر

صادق پرنٹنگ پریس کوئٹہ

ایڈیٹوریل بورڈ

جاوید اختر، جمیل بزدار، عابدہ رحمٰن، جہاں دوست، شاہ ملوک

قیمت 200 روپے | شش ماہی 1200 روپے | سالانہ 2400 روپے

ISSN-2520-4070

ملتان : رانا شہباز 03009632552 ،اور نواز پاندا 03008634392

کراچی : عیسیٰ بلوچ 03222609415 ،اور شاہ زمان 03002103503

ساہیوال : زکریا خان 03006931011

0812827968 , 03003829300 editor@sangatacademy.net

MARRI LAB DR SHER MUHAMMAD ROAD QUETTA www.sangatacademy.net

SHONGAAL

3	ماحولیاتی بحران	
6	خیرات نہ بانٹو، اصلاحات کرو	
8	کوئلہ کان حادثہ	

POHOZAANT

میر عبدالعزیز کرد	محمد نواز کھوسہ	9
ساحر لدھیانوی کی شاعری کائنات	عابد حسین عابد	10
خالق داد آریا	عبدالوہاب/قیوم سربازی	12
ہجوم کے ہاتھوں ہلاکتوں کی تاریخ	مہ ناز رحمان	14
غوث بھار	بشیر بیدار	16
پروفیسر ڈاکٹر ضیاالرحمٰن کبدانی	امانت حسرت	16
رسالہ عوامی جمہوریت	شاہ محمد مری	17
کراچی میں بلوچ ومکرانی کے قصے	رمضان بلوچ	21
عورت اور آزادی	شئے مرید	23

KISSA

خاخر ناراج	آغا گل	34
لاش بول رہی ہے	غنی پرواز	37
انسان چکا خودغرض انت	ڈاکٹر فضل خالق	38
جاپانی املوک	بی بی آن لی/عقیلہ منصور جدون	39
بھگوان کے موالی	شاہد اقبال کامران	48

SHERAANI RALI

عطیہ داؤد، ن م دانش	--
سلمٰی جیلانی	13
لالہ رخ	15
مایا کوفسکی	24
شاہ میر، گلناز کوثر، امر پیرزادہ	27
عابد رضا	30
رفیق مغیری	32
فاطمہ حسن	33
ڈاکٹر منیر رئیسانی	36
میر ساگر، نسترن احسن فتحی	48

HAAL HAWAAL

سنگت ادبی دیوان (ساد) لیاری	رپورٹ عیسیٰ بلوچ	29
:جنرل باڈی میٹنگ	جمیل بزدار	29
سنگت ادبی نشست راڑاشم	جمیل بزدار	30
سنگت پوہ زانت	جمیل بزدار	31

KITAB PACHAR

گندم کی روٹی	اشرف ملک	33

ماحولیاتی بحران

ابھی آٹھ دس سال قبل تک ہمارے خطے میں ''گلوبل وارمنگ'' ایک بورژوا بات لگتی تھی۔ ترقی یافتہ بورژوا ممالک میں بھی کمیونسٹ پارٹیاں، یا پھر بس جرمنی میں گرین پارٹی ہی اس معاملے میں سنجیدہ لگتی تھی۔

ہم دو لاکھ سالوں سے اِس 4.5 بلین برس پرانی زمین پہ رہ رہے ہیں۔ ہمارے کلاسیک اور فوک ادب میں کسی کلاؤڈ برسٹ کا کوئی ذکر نہیں، کسی سونامی پہ کوئی مصرع موجود نہیں۔ خیر خیریت کے دو لاکھ سال۔ ہم لوگ تو اس وقت ہوش میں آئے جب ہر لحاظ سے رنجیدہ و ژولیدہ بلوچ قحط اور سیلابوں کی متضاد تباہ کاریوں کی باریوں کا شکار بننے لگے۔ ایسی بربادی کہ لوگوں کے لیے پیٹ بھرنے کا بڑا ذریعہ تباہ ہوتا رہا۔ اور یہ تو معلوم ہے کہ طویل دورانیے کی نیم فاقہ کشی سے بڑا عذاب کوئی نہیں ہوتا۔ اجتماعی بھوک کی سست رفتار موت، مسنگ یا مسخ شدگی سے بھی بہت بھیانک بات ہوتی ہے۔

تکبر اور شاونزم کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ ہم انسان، اکیلے اس زمین کے باسی نہیں ہیں۔ بلکہ ہم اسے دوسرے سپیشیز کے ساتھ شیئر کرتے ہیں۔ چنانچہ موسمی تغیر سے صرف انسان ہی نہیں مر رہا، بلکہ اُس کے ساتھ محنت کرنے والے، یا اسے دودھ اور گوشت دینے والے جانوروں نے بھی مرنا ہے، انسان سے بھی پہلے انہیں مرنا ہے۔ فصل نہیں تو جھاڑیاں کہاں، درنگ ءِ زامر کہاں، لیموئی بر کہاں، درخت کہاں۔ بلبلیں، تتلیاں۔۔۔۔ الغرض زندگی نہیں۔

بلوچستان اس گلوبل کلائمیٹ چینج کا اپی سنٹر بن چکا ہے۔ یہاں سرد علاقوں میں چھ سات ماہ کی سردیاں ہوا کرتی تھیں۔ اب محض ایک ماہ کی سردی پڑتی ہے۔ ستمبر سے لے کر اپریل تک چھ ماہ کے دوران برف اور بارشیں ہوتی تھیں، اب صرف مارچ کے مہینے کے پندرہ دنوں کے اندر اندر برف اور بارش وحشتناک انداز میں برستی ہے۔ تباہ کن سیلاب، ژالہ باری، آسمانی بجلی۔ اِن پندرہ دنوں میں ایک قیامت صغری کا نزول ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قیامت اپنے اثرات اگلے دو تین سال تک جاری رکھتی ہے۔ مگر نئی قیامت تو اگلی سردیوں میں پھر آنے والی ہوتی ہے۔ ہم اس سلسلے میں مون سون کی تباہیوں کی بات ہی نہیں کر رہے، جب پورا زرعی اور میدانی بلوچستان پہاڑوں سے آئے سیلابوں کے تھپیڑوں کا شکار بن جاتا ہے۔ اب ہمیں، ہمارے عام آدمی کو معلوم ہوا کہ ماحولیاتی تبدیلی یا گلوبل وارمنگ کیا ہوتی ہے۔ واقعتاً مطالعہ کی بہ نسبت کسی چیز کو خود بھگتنا لاکھ گنا معلوماتی ہوتا ہے۔

اگر یہ بربادی مقامی ہوتی تو یقیناً ہم کالے بیل خیرات کر کے، پیر و مرشد کی ناراضگی دور کرنے کی کوشش کر کے، چیونٹیوں کے کسی غار کیپر ستتش کر کے اسے ٹالنے کی کوشش کرتے، یا پھر ہمارا عام آدمی اپنی پاک پوتر زندگی میں کوئی اور گناہ تلاش کرنے میں لگ جاتا۔ یا پھر قیامت کی نشانی سمجھ کر مزید عبادت کرتا۔ مگر چونکہ یہ عالمی فناں می نن ہے اس لیے عالمی پیمانے پہ تحقیق سے پتہ چلا کہ یہ دوھری اور جڑواں مصیبت یعنی قحط سالی اور سیلاب کے پیچھے کپٹلزم کا ہاتھ ہے۔ ایک حالیہ رپورٹ میں یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس دنیا پر ہونے والے ماحولیاتی اثرات 16 فیصد امیر لوگوں کی آبادی کی وجہ سے پڑ رہے ہیں۔ گو کہ اب یہ حقیقت سامنے آ رہی ہے کہ امیر لوگوں کا طرز زندگی جو رہا ہے اور جس کے یہ عادی ہو چکے ہیں یہ اس زمین پر مزید لمبے عرصے تک جاری رکھنا ممکن نہیں رہے گا۔

لالچی کپٹلزم نے جنگلات کی کٹائی کی اور اس عمارتی لکڑی کو بیچ کر بہت منافع بنایا۔ نیز انہیں صاف کر کے وہاں کھیتی باڑی شروع کر دی۔ اس نے جنگلات کی بے رحم کٹائی، کوئلہ پٹرولیم گیس (یعنی فوسل فیول) کا صنعت میں استعمال، اور گاڑیوں انڈسٹریوں سے نکلتے دھوئیں کے ہاں ''زندگی'' یرغمال کر دی۔ انہی نقصان دِہ گیسوں کو گرین ہاؤس کہتے ہیں۔ ان گیسز کو گرین ہاؤس گیسز اس لیے کہتے ہیں کہ ان کی مناسب مقدار پودوں کی نشوونما

کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ (کاربن ڈائی اکسائڈ ہی گرین ہاؤس گیس ہوتی ہے۔)

اگر یہ گیسز مقدار میں زیادہ ہوں تو سورج کی گرمی کی مقدار ان میں پھنس جاتی ہے، اور یوں زمین پہ گرمی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسے گلوبل وارمنگ کا نام دیا گیا۔ یہی گلوبل وارمنگ اُس کلائمیٹ چینج کا سبب ہے۔ جس کے نتیجے ہم بھگت رہے ہیں۔

انسان ہی نے کیڑے مار دوائیں اور کھادیں ایجاد کیں تا کہ پیداوار بڑھے۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہی دونوں چیزیں بایوڈائیورسٹی کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ سبزے کے خاتمے، درختوں کی کٹائی اور بڑھتی ہوئی فضائی آلودگی کے باعث ہمارے دوست اور واقف اور ہمدرد جاندار نایاب ہوتے جا رہے ہیں۔ اور یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ گھاس کی ہریالی ہر سال اُس وقت زیادہ شدت سے پیدا ہوتی ہے اگر ہری بھری گھاس کو چرنے والے جانور میسر ہوں گے۔ اگر گھاس چرنے والے جانور ہی موجود نہ ہوں تو گھاس دوسری بار اس شدت کے ساتھ پیدا نہیں ہوگی جیسا پہلی بار ہوا تھا۔''

اس مہیب عالمی مسئلے پر بے شمار کانفرنسیں سیمینار، سمٹ میٹنگز اور معاہدے ہوتے رہے۔ مگر کیپٹلزم جو کہ انڈسٹریل ممالک کی قیادت میں آج کا عالمی نظام ہے، منافع، مقابلہ اور لالچ پہ مبنی نظام ہے۔ اس نے سارے معاہدوں کے باوجود کسی نکتے پر عمل نہ کیا اور اس زمین پر زندگی کو خطرے سے دوچار رکھا ہوا ہے۔

اور اب یہ بربادی بلوچستان اور سندھ پہ ڈیرے ڈال چکی ہے اس لیے ہم اِس کی کچھ زیادہ ہی شد بد رکھتے ہیں۔

ہمارے مون سونی علاقے میں، نیز غیر مون سونی علاقوں میں بھی بارشوں کا پیٹرن بدل چکا ہے۔ اب بہت کم وقت میں شدید بارشیں ہوتی ہیں۔ یوں ایک طرف طویل خشک سالی نازل رہتی ہے اور دوسری طرف فوری سیلابیں شدید انداز میں برپا ہوتی ہیں۔

ساحل اور سمندر کے ماحولیات پہ اثر کا ہمیں اندازہ ہی نہ رہا۔ حالانکہ اس دنیا میں جو لگ بھگ 500 ساحلی علاقوں میں تعمیر شدہ شہر موجود ہیں، ان میں سے 50 شہر اور گاؤں بلوچستان کے ہیں۔ مگر بلوچ ساحل اور سمندر تو بالکل صاف شفاف ہیں۔ سمندری پالیوشن دیکھنا ہو تو دنیا کی بڑی سمندری شاہراہوں اور بندرگاہوں پہ دیکھیے۔ سمندر تو نیلا ہوتا تھا۔ مگر وہاں اب یہ سیاہ کالا پڑ چکا ہے۔

ہم جغرافیائی ناواقفیت کا شکار ہیں۔ ہم روزگار دینے والے شعبوں، یعنی ڈاکٹری اور انجینئرنگ وغیرہ کے بارے میں تو کچھ نہ کچھ جانتے ہیں مگر ہم نے جغرافیہ کے بارے میں خود کو بالکل بھی باشعور بننے نہ دیا۔ ہم نے فضا میں موجود گیسوں کے بارے میں معلومات اپنے دماغ میں جانے نہ دیں۔ کیمیکل تبدیلیاں کس طرح پورے کرہِ ارض کو جکڑتی ہیں ہم نے جاننے کی کوشش ہی نہ کی۔ یہ نہ جانا کہ کاربن ڈائی اکسائڈ کی زیادتی سے سمندر تیزاب ہو جاتے ہیں، یا پھولوں پہ تتلیوں کا منڈلانا دراصل پولی نیشن کا عمل ہے۔ ہم نے جنگل کی اہمیت اور درخت کے تقدس کو کچن میں سوئی گیس کی غیر موجودگی کا بارٹر ٹریڈ سمجھا۔ سرکار پہ زور نہ چلا تو کلہاڑی اپنے پیروں پہ دے ماری، جنگل کاٹنے شروع کر دیے۔

بلوچستان نے اپنے بارے میں بھی تفصیلات نہ دیں۔ بلوچستان جو کہ رقبہ اور تنوع کے اعتبار سے خود ایک برصغیر ہے۔ بلوچ کی واضح اکثریت کو اپنے سمندروں کے بارے میں معلومات ہی نہیں ہیں۔ سمندر، ماحولیات کے لیے کیا کرتا ہے، اس کے اندر کیا کیا خزانے چھپے ہوئے ہیں عوام نہیں جانتے۔ اور پھر سمندری مخلوق کی تفصیلات تو ہمیں بالکل معلوم نہیں ہیں۔

باہر کی دنیا کی طرف تو ہم نے جھانکا ہی نہیں۔ ہمیں گلشیئرز کا پتہ نہیں۔ حتی کہ مست توکلی کی شاعری میں سے ہم نے ماحولیات کے بارے میں کچھ اخذ ہی نہ کیا۔

بلوچستان میں ایمزون کے گھنے جنگل تو نہیں ہیں مگر جو درخت موجود ہیں اُن کا رول انتہائی اہم ہوتا ہے۔ یہ درخت بے شمار کام سرانجام دیتے ہیں۔ کیپٹل ازم بدبخت نظام ہے۔ اس نے پہلے ہم سے ہمارا اپنا کمیونل والا کوڈ چھین لیا۔ عجب عجب لچھن دکھا کر اپنی چمک میں اس قدر گرفتار کر لیا کہ ٹریکٹر ملنے سے قبل ہی ہم نے اپنے بیل بیچ ڈالے۔ ہمارے ہاں بہت عمر کا درخت، یا گھنا درخت نہیں کاٹا جاتا تھا۔ ہم اس درخت کو ولی سمجھتے تھے۔ ورنہ یہ مشہور

کر لیتے کہ اس درخت پہ جنوں کا ٹھکانہ ہے۔ انہیں تنگ نہ کیا جائے ورنہ وہ بہت نقصان پہنچائیں گے۔ دیگر درختوں کے کاٹنے کے بھی اخلاقی کوڈ ہوا کرتے تھے۔ مثلاً جلانے کے لیے سبز درخت نہیں کاٹا جاتا تھا۔ صرف سوکھے درخت اکٹھے کر کے جلانے کے لیے لے جائے جاتے۔ دیہات گاؤں میں سوختنی لکڑی بیچی نہیں جاتی تھی۔ ہر ایک اپنی ضرورت کے مطابق خود لکڑیاں چنتا تھا۔ درخت کو برکت، امن سرسبزی، خوشحالی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

انسان واحد سپیشیز ہے جو جنگلات کو سب سے بڑے پیمانے پر تباہ کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اور انسان ہی وہ واحد سپیشیز ہے جو جنگلات کو سب سے بڑے پیمانے پر بچا سکتا ہے۔ اور اس مسئلے کا حل بھی صرف انسان کے پاس ہے۔ کائنات بھر کے اشجار و چرند پرند اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ سرکاری محکمے شجر کاری کے نام پہ ایک اور جہالت یہ کرتے ہیں کہ وہ مقامی درخت نہیں لگاتے۔ جو کہ ہزاروں سالوں سے ہماری زمین، آب و ہوا اور ماحول سے مطابقت رکھتے ہیں۔ بناوٹی، فیشنی اور سجاوٹی پودے لگانے سے ماحولیاتی آلودگی ختم تو کیا، کم بھی نہ ہوگی۔

ماحولیاتی بحران کے معاملے میں مغربی ممالک اور چین نے کافی پیش رفت کی ہے۔ کچھ ممالک نے سڑک پہ زہریلی گیسوں میں کمی کے لیے سائکلیں چلانے کی حوصلہ افزائی کر کے زبردست کام کیا ہے۔ دنیا میں پٹرول ڈیزل گاڑیوں پر پابندی لگائی جا رہی ہے اور اس کی جگہ پر بجلی سے چلنے والی روڈ ٹرانسپورٹ چالو کر دی ہے۔ اسی طرح ڈرون سے سامان کی نقل و حرکت کے شعبے کو ترقی دی جا رہی ہے۔

لفظ ''شاپنگ'' ہماری ڈکشنریوں کے اندر باقاعدہ ایک اہم کام کے بطور شامل ہو چکا ہے۔ یہ بدبخت شاپنگ ہماری شناخت کے کنفیوژن کو بڑھاتا ہے اور زندگی کی سمت بدلنے کا باعث بنتا ہے۔ کنزیومرازم (Consumerism) ہمیں ایسے خیالات اور سوچوں میں پھنسا لیتا ہے کہ ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم اپنی شخصیت کو چیزیں خرید کر بنائیں گے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہوا کہ جب ماحولیات کے ساتھ کی گئی زیادتیوں نے بدلہ لینا شروع کر دیا تو اندازہ ہوا کہ اسے صرف ہم ٹھیک نہیں کر سکتے۔ یہ بحران کیپٹلزم کا بحران ہے۔ کیپٹلزم نے بہت عرصہ سے لکڑی بیچنے، کارخانے لگانے، ہاؤسنگ سکیم کھڑی کرنے، یا زراعت کے لیے بڑے پیمانے پر جنگلات کا صفایا کر دیا۔ وہی کارخانوں سے زہریلا پانی دریاؤں سمندروں میں انڈیلتا رہا۔ اسی نے چمنی اور ٹرانسپورٹ کے دھوئیں سے فضا کو آلودہ کر دیا۔ اتنے بڑے پیمانے کی تباہی کو محض ایک کمیونٹی، ایک ملک ریورس نہیں کر سکتا۔

غربت و بھوک کی موجودگی میں ماحولیاتی آلودگی کی طرف راغب ہونا آسان بات نہیں ہے۔ مگر کیا کیا جائے، سامنے موت ہے۔ انتہائی سنگین صورت حال سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ محض ماحولیات ماحولیات چیخنے سے بات نہیں بنے گی۔ پورے انسانی طرز زندگی کو بدلنا ہوگا۔ اچھی صحت اور فلاح و بہبود کا نظام بنانا ضروری ہو گیا ہے جہاں کوالٹی ایجوکیشن ہر ملک میں بچے کا حق ہو۔ عورتوں مردوں کو برابری کے حقوق حاصل ہوں، صاف پانی مہیا ہو۔ کلین انرجی لوگوں کی پہنچ سے باہر نہ ہو۔ مناسب روزگار اجتماعی سطح پر انسان کو مہیا ہو۔ صنعت، ماڈرنزم اور انفراسٹرکچر کے ذریعے ترقی کے نئے طریقوں کو پرموشن ملے۔ ترقی کا نیا ماڈل قائم ہو جس تک سب شہریوں کی برابر رسائی ہو۔

موسمیاتی تبدیلی کے خلاف ایکشن کرنے کی گلوبل سطح پر ضرورت ہے۔ پانی کے اندر موجود زندگی کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے سمندروں کو صحت مند رکھے، صاف رکھے۔ زمین پر زندگی کی مدد کا نظام جنگلات اور سبزہ زاروں کی وجہ سے قائم اور برقرار رہتا ہے، اس لیے جنگلات کے خاتمے کو روکا جائے۔

بے شک کلائمیٹ تبدیلیاں ہمیں جس تباہی سے دوچار کر رہی ہیں، ہمارے لوگ اسے قومی بقا کے لیے خطرہ سمجھیں گے۔ اور پھر ایک دو سال کے اندر اندر کلائمیٹ ایکٹوزم میں کود پڑیں گے۔ مگر یاد رہے کلائمیٹ ایکٹوزم سرمایہ دشمنی ہے، سامراج دشمنی ہے۔

لیڈ بلوچستان کو کرنا پڑے گا۔

خیرات نہ بانٹو، اصلاحات کرو

عوام کی زندگی کا معیار زمیں بوس ہو چکا، امیر اپنی دولت کے ساتھ اپنا وطن تو کیا یہ براعظم بھی چھوڑ چکا۔ عوام صحت، تعلیم، رہائش، اور بجلی گیس اور پٹرول کے بلوں کی ادائیگی کے مہیب مراحل سے گزر رہے ہیں اور امیر آئی ایم ایف سے مزید پیسوں کے نشے میں دروازے کھٹکٹا تا ہے۔ غریبوں کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور امیر اپنی تعداد کو محدود سے محدود تر کرنے کی کوششوں میں کامیاب ہوتے جا رہے ہیں۔ قیمتیں اونچی اڑان سے باز نہیں آ رہیں، سیلاب ہیں کہ تھمتے نہیں۔

اس سارے پس منظر میں سماج دائیں طرف سرکتا گیا، محنت دشمن بنتا گیا، فرقہ وارانہ اور نسل پرستانہ بنتا گیا اور اس کے تقریباً ہر شعبہِ زندگی پر فاشزم چھانے لگا۔ پاپولزم اس سب شیڈز کا واحد نام ہے۔ عوام کی ٹریجڈی تو اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ اسے جو حکمران ملے ہیں وہ انسانی اوصاف تک سے خالی نکلے۔ کوئی نیا خیال، نئی حکمت عملی، نئے نعرے نہیں۔۔۔ آئی ایم ایف کے فیڈ کردہ روبورٹ ہیں یہ۔

شہباز شریف کو اب پھر وزیراعظم بنا دیا گیا۔ سب کا خیال تھا کہ وہ اب عبرت پکڑے گا، عوام اُس کی جن حرکات و اقدامات کو پسند نہیں کرتے تھے وہ ان سے اجتناب برتے گا اور حکمرانی کے نئے طرز طریقے اختیار کرے گا۔ مگر نہیں!۔ پھر اُس کے وہی چھاپے ہیں۔ پھر اس کے وہی ناگہانی دورے ہیں۔ کسی افسر کو معطل کر رہا ہے، کسی کو ٹرانسفر۔ ارے بھئی اکیسویں صدی میں کسی یوٹیلیٹی سٹور پر وزیراعظم کا چھاپہ مارنا بنتا ہے؟۔ آپ کی پالیسی اور نظامِ گورننس خود آپ کو کیوں نہیں بتاتا کہ حالت کیا ہے؟۔ مطلب یہ کہ اس نے کچھ نہیں کرنا، کوئی پالیسی نہیں بنانی۔ یوں وقت گزاری کے لیے اسسٹنٹ کمشنر والے کام کرنے ہیں۔ ان حرکتوں سے اب پبلسٹی بھی نہیں ہوئی۔ کوئی پراڈکٹوٹی نہیں ہوتی۔۔۔ محض عوام کا دل جلتا ہے۔

شہباز کا سابقہ دور بھی ہنگامی اور سرپرائز دوروں کا دور تھا، تو کیا آج پنجاب کا تھانہ کلچر تبدیل ہو چکا ہے؟ کیا سرکاری ہسپتالوں میں لواحقین کو علاج کی بہتر سہولیات میسر آ چکی ہیں۔ کیا سرکاری اداروں سے عوام کو بہ آسانی ریلیف مل رہا ہے؟

وہ خود تو یہی کرتا رہا، اب اس نے پنجاب کی وزیراعلیٰ اور اپنی بھتیجی مریم نواز کو بھی اس کام پہ لگا دیا۔ شہباز شریف اور اس کی بھتیجی وہی ناگہانی اور ناگمانی سرپرائز دورے کرتے ہیں۔ قدموں کی چاپ کبھی اس ضلع میں ہوتی ہے کبھی یہ تراپ تروپ دوسرے ضلع میں۔ اِس کو شاباش کہو، اُس کو معطل کرو۔ بھئی بنیادی کام کرو، کوئی بنیادی فیصلے کرو۔ نہیں۔ بس لکیر کی فقیری کرنی ہے، نئے آئیڈیاز جاگیرداروں کے پاس ہوتے کہاں ہیں!۔ مریم نواز تو اب لوگوں کے گھروں میں گھس کر وہاں کی عورتوں سے آشیر بادیں لیے پھرتی ہے۔

آئی ایم ایف کے در پہ حسبِ سابق بھیک کا کشکول، پرائیوٹائزیشن کے وِرد۔ کوئی تعلیمی پالیسی نہیں بس دانش سکول۔ کوئی زرعی اصلاحات نہیں بس کسان کو کھاد بیج۔ کوئی صنعتی وژن نہیں بس پرائیوٹائزیشن۔ کوئی خارجہ پالیسی نہیں، بس امریکہ اور خلیجی ممالک کی کاسہ لیسی۔

اور پیپلز پارٹی دیکھیے۔ ستر سالہ معمر یہ سیاسی پارٹی ابھی تک سیدوں، پیروں، سجادہ نشینوں کے ہاں رہن ہے، وہ ذرا سامنے سے ہٹیں تو یہ پارٹی نہ سیاسی رہے گی اور نہ عوامی۔ سینیٹ چیئرمین پیر، سندھ وزیراعلیٰ پیر، اسمبلی ممبران میں پیر ہی پیر۔ نہ صرف سندھ میں، بلکہ پیروں کے دیس ملتان میں بھی۔ ایسی بدبختی کہ فیوڈل ازم اس کی جان نہیں چھوڑتی۔ ایسی نااہلی کہ وہ صنعتی کلچر کو گلے ہی نہیں لگا پاتی۔ جب بھی الیکشن آتے ہیں پیپلز پارٹی روٹی کپڑا اور مکان کا 50 سالہ پرانا گدڑ سنگھی نعرہ گدڑی سے نکال لیتی ہے اور جھاڑ جھوڑ کر عوام میں فروخت کرتی ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ جاگیرداروں سے زمین لے کر اسے بے زمین کسانوں میں بانٹ دو۔اس طرح خوراک اور اناج کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور سماج سے فاشزم بھی ختم ہوگا۔

ہم کہتے ہیں کہ بڑی زراعت اور لائیوسٹاک پر ٹیکس لگاؤ۔مگر یہ لوگ ایسا نہیں کرتے اس لیے کہ بڑے زمیندار تو اُن کے ساتھی ہیں،ان کے ''پارلیمنٹ فیلو'' ہیں،ان کے ''کابینہ کولیگ'' ہیں۔

عوام کہتے ہیں کہ آئی ایم ایف کے قرضے کسی صورت واپس نہیں کیے جاسکتے۔اور یہ کہ سُود ادا کر کر کے ہم اس قرض سے کئی گناہ زیادہ رقم پہلے ہی ادا کر چکے ہیں۔اس لیے اس سے انکار کر دو اور ہمسایہ ممالک سے تجارتی و صنعتی تعلقات استوار کر کے ملک کو خود کفیل بنا دو۔مگر یہ حکمران پارٹیاں دوڑ دوڑ کر آئی ایم کے پیر چھونے جاتی ہیں۔اس کے الٹے سیدھے سیاسی،دفاعی اور معاشی مطالبے مانتی جاتی ہیں اور مزید بیس برس کے لیے مزید قرضے لے کر ملک کی سالمیت اور آزادی رہن رکھ کر آتے ہیں اور سینہ پھلا کر مقروض ہونے پر فخر کرتے ہیں۔

عوام کہتے ہیں کہ اتنا بڑا ریاستی ڈھانچہ ملک پہ بوجھ ہے،اس کی تعداد،اختیارات اور مراعات گھٹا دو۔دیگر غیر پیداواری اخراجات بھی کم کرو۔اس طرح حاصل ہونے والی بہت بڑی رقم سے ملک کو صنعتی بناؤ۔مگر یہ لوگ اُس طرف سرکتے تک نہیں۔

عوامی دانشور کہتا ہے کہ ملک میں نچلے طبقات،نسلی اور مذہبی اقلیتیں،عورتیں اور محکوم قومیں سخت محکومی اور غلامی میں ہیں۔اُن کے حقوق دو۔مگر یہ لوگ ایک آدھ سکھ،یا کرسچین پٹھو کو وزارت پہ بٹھا کر تاثر دیتے ہیں کہ گویا اقلیتیں محفوظ ہو گئیں۔ایک آدھ عورت کو منسٹر بنا دیا،ایک ''اپنا'' بلوچ وزیراعلیٰ بنا کر سارے سادہ پنجابیوں کو باور کرواتے ہیں کہ سارا اقتدار بلوچوں کو عطا کیا گیا۔

عوام کہتے ہیں کہ الیکشن لڑنے کو عام آدمی کے لیے ممکن بنا دیا جائے۔مگر یہ لوگ سردار،وڈیرہ،خان اور چودھری کو نام نہاد ''الیکٹے بل'' قرار دے کر،اور اس سے پیسے لے کر،اسے ٹکٹ دیتے ہیں۔اور یوں اسمبلی میں جاگیردار بھرتی ہو کر حزب اقتدار اور حزب اختلاف تشکیل کرتے ہیں۔یوں سرمایہ داری والی پارلیمانی جمہوریت فیوڈلوں کو تحفہ کی جاتی ہے۔

عوامی دانشور کہتے ہیں کہ تعلیم لازمی ہو،مفت اور سائنسی ہو اور مادری زبانوں میں ہو۔مگر پیپلز پارٹی اور ن لیگ تعلیم کو دقیانوسی،رجعتی،مہنگی رکھے ہوئے ہیں۔

عوام،صحت کی مفت سہولیات اپنے گھر کے دروازے پر چاہتے ہیں۔مگر یہ لوگ اربوں روپے ہیلتھ کارڈ سکیم جاری کرتے ہیں۔اس طرح پرائیویٹ ہسپتالوں کو پیسہ دے دے کر مالک سرمایہ داروں کو کروڑ پتی بناتے جاتے ہیں۔حالانکہ انہی پیسوں کو سرکاری ہسپتالوں پہ خرچ کر کے عوام کو صحت کی سہولتیں دی جاسکتی ہیں۔

لوگ ٹریڈ یونین،اور سٹوڈنٹس یونین کی بحالی چاہتے ہیں،پریس کی آزادی،تقریر و تحریر و اجتماع اور تنظیم کاری کا حق مانگتے ہیں۔مگر یہ دونوں حکمران پارٹیاں لاکھ بہانوں سے اس طرف آدھا قدم بھی اٹھانے کو تیار نہیں ہوتے۔

مگر معاملہ سیاہ ہے۔پالیسیاں سیاستدانوں نے بنانی نہیں ہیں۔بڑے ریفارم انہوں نے کرنے نہیں۔اس لیے کہ یہ اُن کے ہاتھ میں نہیں ہے۔IMF کے ہاتھ میں ہے یا اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھ میں۔اس لیے یہ سول حکومت گھر کی مرغیاں ذبح کرتی رہے گی۔مضبوط لوگوں پر زور نہیں چلتا تو غریب تو موجود ہے،انہی پہ بوجھ بڑھاؤ۔

یہ لوگ راشن تقسیم کرتے نظر آئیں گے۔جو کہ سرمایہ دارانہ مکاری اور بورژوازی کی ساحری ہے۔بھئی،بجلی اور گیس کے بلوں میں کمی کر دو اور پٹرول سستا کر دو۔۔۔راشن بھیک میں لینے کے بجائے لوگ خود اپنی محنت کے پیسوں سے خرید لیں گے۔

ریاستیں خیراتی ادارے نہیں ہوتیں۔ ریاستیں عوامی حق میں پالیسیاں بناتی ہیں۔لوگوں کو بھکاری نہ بناؤ، خیرات خور نہ بناؤ۔۔۔۔خیرات نہیں،ضروریاتِ زندگی سستی کرو۔

کوئلہ کان حادثہ

ابھی چند روز قبل بلوچستان کے ضلع ہرنائی میں کوئلے کی کان سے 12 کان کنوں کی لاشیں نکال لی گئیں۔

خیال رہے کہ ہرنائی میں کوئلے کی کان میں گیس بھرنے سے دھماکے کے بعد 10 کان کن پھنس گئے تھے جن کی مدد کے لیے جانے والے 8 مزید کان کن بھی پھنس گئے۔

معلوم ہوا کہ وہاں نہ تو حفاظتی سامان موجود تھا اور نہ کان کے اندر گیس کی سطح ناپنے کا کوئی آلہ موجود تھا۔

کانوں کے یہ حادثے روزمرہ معمول بن چکے ہیں۔سرکار مائن اونرز کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔اور مائن اونر اپنے منافع میں اضافے کی خاطر مزدوروں کے حفاظتی اقدامات پر کوئی توجہ نہیں دیتے۔کوئلہ کی کانیں شہروں سڑکوں سے بہت دور واقع ہیں۔وہاں کوئی صحافی یا ٹورا سٹ نہیں جاتے۔عام انسان کو پتہ ہی نہیں کہ وہاں کان کن غلاموں کی زندگی گزار رہے ہیں۔نہ رہائشی سہولتیں ہیں نہ ہسپتال موجود ہیں اور نہ طبی مراکز۔بس سب کچھ کان مالک کے رحم وکرم پر چلتا ہے۔اور ہر سال سینکڑوں مزدور حادثات میں مارے جاتے ہیں۔

کوئلہ کانوں کے مزدوروں کا کوئی ٹریڈ یونین نہیں ہے۔روشن فکر ادیب اور روشن خیال سیاستدان بھی اپنی کمزوری کے باعث ان اموات کی یادگیری بعد میں نہیں کرتے۔ہمیں تلف شدہ اِن زندگیوں کو یاد رکھنا چاہیے اور مزید اموات کو روکنے کی جدوجہد کرنی چاہیے۔ہر شخص کام کے بعد زندہ گھر آنے کا مستحق ہوتا ہے۔ہمیں اندازہ ہے کہ کیپٹلزم میں ایسا نہیں ہوتا۔اس نظام میں مزدوروں کو مشینری یا عمارتوں کی طرح بہت منافع کمانے کے ذریعے کے بطور دیکھا جاتا ہے۔کیپٹلزم کے اندر مزدور منافع کے لیے رکاوٹ ہوتے ہیں۔ان کی حفاظت اہم نہیں ہوتی۔ان کے لیے اہم یہ بات ہوتی ہے کہ کی ہوئی سرمایہ کاری کا اچھا بھلا منافع ملے۔یہی تو وجہ ہے کہ ہر سال کئی مزدور زندہ گھر نہیں آتے۔اور یہی وجہ ہے کہ کئی مزدور گھر آتے ہیں زخمی حالت میں۔

کاش کوئی انسان دوست حکومت آئے اور معدنی صنعت کو قومی ملکیت میں لے کر وہاں کان مزدور کے لیے بڑے پیمانے کے حفاظتی اقدامات کرے۔

میر عبدالعزیز کرد

محمد نواز کھوسہ

میر عبدالعزیز کرد 1907 کو مستونگ میں میر ٹلن خان کے گھر پیدا ہوئے۔ پانچ سال کی عمر میں والدہ کا انتقال ہوا۔ مستونگ کے انگلش ورنیکلر مڈل سکول میں تعلیم کے دوران ہی 12 سال کی عمر میں والد بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اس طرح تعلیم کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا۔ مگر بقول ڈاکٹر شاہ محمد مری" کرد صاحب نے اپنی خود تعلیمی کا سلسلہ عمر بھر جاری رکھا۔ مہاتما گاندھی، مصطفےٰ کمال پاشا، اور غازی امان اللہ خان وغیرہ کی تحاریک آزادی کا بغور مطالعہ کیا، سعدی، آزاد، غالب، بیدل، جامی، نظیری، حافظ و اقبال کا کلام پڑھا۔"

میر عبدالعزیز کرد نے کمسنی میں ہی سامراج مخالف سیاسی اثر اپنے والد سے لیا۔ ان کے والد ٹلن خان ریاست قلات کے ملازم ہونے کے باوجود بھی اپنے سیاسی خیالات کی وجہ سے انگریز سامراج اور ان کے حامی سرداروں کے خلاف تھا۔ میر عبدالعزیز کرد نے کم عمری ہی میں 1920 میں اولین بلوچ شہری منظم سیاسی تنظیم "ینگ بلوچ" کی بنیاد رکھ کر جدید انداز کی سیاست شروع کی۔ بلوچ قبائلی معاشرے میں سیاست کرنے کا نیا تجربہ تھا۔ جلسہ، جلوس، ہڑتالیں اور قرار دادیں۔ "ینگ بلوچ" کا مقصد ملکی ملازمین کے حقوق کا تحفظ کرنا تھا۔ ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے آنے والے ملازمین اپنے رعب و دبدبے سے مقامی لوگوں اور ملازمین کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ آگے چل کر "ینگ بلوچ" کا نام "انجمن اتحاد بلوچستان" رکھ دیا گیا۔ 1929 میں اسے یوسف عزیز مگسی جیسا کامریڈ مل گیا۔ جس کے بعد بلوچستان کی اس پہلی باضابطہ سیاسی پارٹی کا ''اعلان'' کیا گیا۔ قلات کے ظالم و جابر وزیراعظم شمس شاہ کے ناروا ظلم و جبر کے خلاف میر عبدالعزیز کرد اور یوسف عزیز مگسی نے اپنے دستخطوں سے ایک پمفلٹ "شمس گردی" شائع کرائی۔

میر عبدالعزیز کرد، یوسف عزیز مگسی، امین کھوسہ اور دیگر کی ولولہ انگیز اور انتھک محنت کے نتیجے میں 1932 میں جیکب آباد میں "بلوچستان اینڈ آل انڈیا بلوچ کانفرس" منعقد ہوئی۔ اسی طرح کی دوسری کانفرنس 1933 میں حیدرآباد میں ہوئی۔ کرد صاحب نے لاہور کے روزنامہ "آزاد" میں سیاسی مضامین بھی تسلسل سے لکھے۔ ریاست کی طرف سے 1934 کو انہیں ناپسندیدہ شخص قرار دے کر شاہی جرگہ کے ذریعے تین سال قید بامشقت کی سزا دے کر مچھ جیل کے حوالے کیا گیا۔ 1935 کے تباہ کن زلزلہ نیاس کے دست و بازو یوسف عزیز کو چھین لیا۔ 1936 میں رہائی ملی۔ سبی چلا گیا اور طویل بحث و مباحثہ اور مشاورت کے بعد دوست احباب کے ساتھ مل کر ایک نئی سیاسی جماعت "قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی" کی بنیاد رکھی۔ عبدالعزیز کرد صدر، میر گل خان نصیر نائب صدر اور ملک فیض محمد یوسفزئی سیکریٹری جنرل منتخب ہوئے۔ قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی کے پروگرام میں یہ باتیں شامل تھیں:

1۔ تمام انسانوں کا خون بہا یکساں ہو۔

2۔ زرشاہی اور زر سرنامی ٹیکس جو سرداروں کی طرف سے لئے جاتے ہیں، بند ہوں۔

3۔ بیگار بند ہو۔

4۔ مالی، پرس اور بجار جو سرداروں کے ٹیکس بن چکے تھے، بند ہوں۔

میر عبدالعزیز کرد کی کوششوں سے یہ جماعت دانشوروں، سرکاری ملازمین اور قبائلی لوگوں کی ایک عوامی پارٹی بن گئی۔ 1938 میں پارٹی کو قلات حکومت میں وزارت ملی اور میر عبدالعزیز کرد جھالاوان کے نائب وزیراعظم بنے۔ 1942 سے 1948 تک ناظم رہے۔ 1948 میں جب قلات کی مرکزیت کو ختم کرنے کی غرض سے مکران کو علیحدہ کیا گیا تو اپنے ساتھیوں سمیت استعفیٰ دیدیا۔ پھر گرفتار ہوگئے۔ اور پھر یہ گرفتاری، نظر بندی معاشی مشکلات کے ساتھ زندگی بھر ساتھ رہے۔ 1958 کے مارشل لاء میں اپنے ساتھیوں سمیت گرفتار کر لیے گئے۔ 1959 اور 1963 میں مچھ جیل میں رہے۔ 1965 میں پورے خاندان سمیت گرفتار کر لیے گئے۔

میر عبدالعزیز کرد نے بھرپور سیاسی زندگی گزاری بقول ڈاکٹر شاہ محمد مری صاحب "ان کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہیں آئی" وہ ہمیشہ عوام سے جڑے رہے اور اپنے موقف سے پیچھے نہیں ہٹے۔ عبدالصمد خان اچکزئی کے مطابق: "وہ آزادیء وطن کے بے صبر عاشق تھے"

میر عبدالعزیز کرد کے معاصرین میں یوسف عزیز مگسی، محمد امین کھوسہ، عبدالصمد خان اچکزئی، محمد حسین عنقا، قادر بخش نظامانی، آغا عبدالکریم، عبدالرحمان بگٹی، پیر بخش المعروف نسیم تلوی، محمد اسلم اچکزئی اور ملک فیض محمد یوسفزئی شامل تھے۔

بلوچستان میں شہری سیاست کا بنیاد رکھنے والا میر عبدالعزیز کرد 15 اپریل 1969 کو ہم سے جسمانی طور پر جدا ہوکر عزیز آباد مستونگ میں آسودہء خاک ہوئے۔

آخر میں میر عبدالعزیز کرد کی خواہش پڑھیئے:

"سرمایہ دارانہ نظام قوم و ملت کے لئے ناسور کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلوچستان کے خانہ بدوش لوگوں کو چھت مہیا کرنا چاہیے، روٹی اور تعلیم کا بندوبست ہو، اور ان کی صحت کا انتظام ہو۔"

ساحر لدھیانوی کی شاعری کائنات

عابد حسین عابد

ساحر لدھیانوی بہت سوں کی طرح مجھ تک بھی بغیر کسی نقاد کے، براہ راست اپنی غزلوں، نظموں اور گیتوں کے ذریعے پہنچا۔ اسے یوں بھی کہہ سکتا ہوں عشق و انقلاب پر بنی جو داستان اُس نے رقم کی وہ انسانی جذبوں کی صداقت ، مثبت سوچ ، محرومی، نا انصافی اور سماجی صورتحال کی عکاس ہونے کی بنا پر کسی اور ذریعے یا وسیلے کی محتاج نہ تھی۔ انسانی سماج کی تمام پرتوں کا جس باریک بینی سے انہوں نے مشاہدہ کیا اور اس مشاہدے کو اپنے بھرپور حسی تجربے و تجزیے کے ساتھ جس سہولت سے قاری تک پہنچایا۔ ایسی عمدہ مثالیں بہت کم دیکھنے کو ملتیں ہیں۔ ایسا مشاہدہ اور تجزیہ بیان کرتے وقت لکھاری عموماً احساس کی شدت کا شکار ہو کر صحافتی طرز اسلوب اختیار کر جاتے ہیں مگر ساحر اُن چند ہنر مندوں میں سے ایک ہے جو اپنے بے پناہ تخلیقی وفور کی بدولت ایسے موضوعات کو تخلیقی انداز میں پیش کرنے کے ہنر سے آگاہ ہیں۔ جو تنقید کی زبان میں صحافتی ذیل میں آتے ہیں۔

اس میں سارا کمال ان کے اُس شعری اسلوب کو جاتا ہے جو عام فہم ہونے کے باوجود گہری فکری معنویت کا حامل ہے۔ یہ آسمانوں، خلاؤں یا ان دیکھی دنیاؤں کا منظر نامہ نہیں، اسی سماج کی منظر کشی ہے جو ابتری کی آخری حدوں کو چھو رہا ہے۔ اس زمین کا نوحہ ہے جو چند خود غرض انسان نما جانوروں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو رہی ہے حسن و عشق کے مضامین ہوں یا سماجی صورتحال کا بیان، جاگیردارانہ معاشرت کی قدریں ہوں یا سرمایہ دارانہ نظام کے نتیجے میں جنم لینے والی انسانی زندگی کی زبوں حالی کہیں کسی جگہ بھی ساحر نے غیر تخلیقی رویہ نہیں اپنایا۔ انہوں نے لفظ کو لفظ سے نہیں۔ لفظ کو زندگی سے جوڑ کر لکھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری آج بھی اپنا مکمل جواز فراہم کر رہی ہے جیسا کہ ان کی اپنی زندگی میں رکھتی تھی۔ میں آج جب اپنے ارد گرد دم توڑتی ،سکتی ہوئی انسانی

زندگیوں پر نگاہ ڈالتا ہوں تو اس کی اہمیت اور افادیت پہلے سے کہیں اور بڑھ کر معلوم ہوتی ہے جو میرے لڑکپن یا جوانی کے دنوں میں تھی۔ کتنی بدقسمتی کی بات ہے کہ پاکستان میں کلیات ساحر کے نام سے چھپنے والی اکثر کتابوں کے دیباچوں میں اُن کے نظام فکر کی بجائے اُن کے عشقیہ معاملات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔

مذکورہ تحریریں ساحر کے دوست راحت ہرکشن کی ہوں یا امرتا پریتم کی سبھی میں صرف اس بات کو ملحوظ خاطر رکھا گیا۔ انہیں ذمہ داری سے بھاگنے والا ڈرپوک شخص قرار دیا۔ جس کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ شادی کی جائے تو کس سے۔ دوسری طرف جب ہم ساحر کی غزلیں، نظمیں یا گیت پڑھتے ہیں تو تینوں اصناف شاعری میں سماجی طبقاتی شعور کا بر ملا اظہار بہت نمایاں ہے میرے نزدیک وہ درست فیصلہ کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ انہیں اس بات کا پورا ادراک تھا کہ اُنہیں کیا لکھنا ہے کس کے لئے لکھنا ہے اور کیوں لکھنا ہے۔ رہی بات ڈرپوک ہونے کی تو یاد دلاتا جاؤں جس وقت وہ اپنی شاعری میں بالا دست طبقات کو شدید حرف تنقید بنا رہے تھے اُن دنوں برصغیر پاک و ہند میں لکھنے اور بولنے پر بہت سخت پابندیاں عائد تھیں۔ یہ جرات رندانہ تو آج بھی بہت سوں کو نصیب نہیں حالانکہ ریاستی سطح پر حکمرانوں نے طریقہ کار تبدیل کر لیا ہے کہ جو بولتا ہے بولنے دو کرو وہی جو اپنی مرضی ہے۔ یہی وجہ ہے جو جس کے دل میں آئے بول رہا ہے غلط سمت توانائیاں ضائع کی جا رہی ہیں۔ جس کا حاصل آج بھی صفر ہے اور کل بھی کچھ نہیں ہوگا۔

کسی شاعر کے حساس ہونے والی بات معنوی اعتبار سے ساحر پر سو فیصد پورا اترتی ہے۔ جس نے اپنی ذات کی تشہیر سے ہٹ کر محروم طبقات کی کھل کر حمایت کی اور تخلیقی ہنر پر بھی حرف نہ آنے دیا۔ وہ نا صرف سماجی صورتحال کی منظر کشی کرتے ہیں بلکہ اپنے قاری کی شعوری سطح پر تربیت کا فریضہ بھی سرانجام دیتے ہیں۔ انہوں نے نظام زر کی محافظ استحصالی قوتوں کے خلاف لڑنے کی ہمت بھی پیدا کی۔ سماجی نا انصافیوں اور ظلم و خیر کے خاتمے کی نوید بھی سنائی۔ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے سب سے پہلے اُن کی غزلوں سے اس مخصوص نظام فکر پر مبنی چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

فن جو ناداد تک نہیں پہنچا
ابھی معیار تک نہیں پہنچا

ہمیں سے رنگ گلستاں ہمیں سے رنگ بہار
ہمیں کو نظم گلستاں پر اختیار نہیں

فقیر شہر کے تن پر لباس باقی ہے
امیر شہر کے ارماں ابھی کہاں نکلے

کچھ اور بڑھ گئے ہیں اندھیرے تو کیا ہوا
مایوس تو نہیں ہیں طلوع سحر سے ہم

نسل در نسل انتظار رہا
قصہ ٹوٹے نہ بے نوائی گئی

یہ رنگ اُن کی نظموں میں بہت نمایاں ہیں جو مارکسی فکر و فلسفے کی بہترین آئینہ دار ہیں۔ حوالے کے طور پر جاگیردار لہو نذر دے رہی ہے حیات ، فنکار، چکلے، بلاوا، بنگال، مادام ، تاج محل، طرح نوا، اے شریف انسانو ، جہازیوں کی بغاوت پر ، خون پھر خون

ہے، مجھے سوچنے دے جیسی نظمیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ یہ وہ نظمیں ہیں جن میں سماجی صورتحال کی عکاسی اور طبقاتی شعور کا یہ وہ بیان شاعرانہ فنی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ مختلف نظموں کے چند ٹکڑے نقل کرتا ہوں۔

نور سرمایا سے ہے روئے تمدن کو جلا
ہم جہاں ہیں وہاں تہذیب نہیں پل سکتی
مفلسی حسن لطافت کو مٹا دیتی ہے
بھوک آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی
میں ان اجداد کا بیٹا ہوں جنہوں نے پیہم
اجنبی قوم کے سائے کی حمایت کی ہے

تم نے جس خون کو مقتل میں دبانا چاہا
آج وہ کوچہ و بازار میں آنکلا ہے
کہیں شعلہ کہیں نعرہ کہیں پتھر بن کر
دیکھ دور افق کی خو سے جھانک رہا ہے
سرخ سویرا
جاگو اے مزدور کسانو
اٹھو اے مظلوم انسانوں
مری صدا کو دبانا تو خیر ممکن ہے
مگر حیات کی للکار کون روکے گا
فیصل آتش و آہن بہت بلند سہی
بدلتے وقت کی رفتار کون روکے گا
نئے خیال کی پرواز روکنے والو
نئے عوام کی تلوار کون روکے گا
زمیں نے کیا اس کا رن اناج اگلا تھا
کہ نسل آدم و حوا بلک بلک کے مرے
ملیں اسی لئے ریشم کے ڈھیر بنتی ہیں
کہ دختران وطن تار تار کو ترسیں

یہاں کچھ مثالیں ان نظموں سے جہاں شاعر اپنے محبوب سے مخاطب ہے لیکن اظہار محبت کے ساتھ ساتھ اپنی فکر کو کس سہولت سے زیر بحث لا رہا ہے آیئے دیکھتے ہیں۔

دیکھ اس عرصہ گہہ محنت و سرمایہ میں
میرے نغمے بھی مرے پاس نہیں رہ سکتے
تیرے جلوے کسی زردار کی میراث سہی
تیرے خاکے بھی مرے پاس نہیں رہ سکتے
آج ان گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں
میں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے

اسی نظم سے دو لائنیں اور ملاحظہ کریں:

جو تری ذات سے منسوب تھے اُن گیتوں کو
مفلسی جنس بنانے پر اتر آئی ہے

یہ چمن زار یہ جمنا کا کنارہ یہ محل
یہ منقش در و دیوار یہ محراب یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
نوح انساں میں یہ سرمایہ و محنت کا تضاد
امن و تہذیب کے پرچم تلے قوموں کا فساد
ہر طرف آتش و آہن کا یہ سیلاب عظیم
نت نئے طرز پر ہوتی ہوئی دنیا تقسیم
لہلہاتے ہوئے کھیتوں پر جوانی کا سماں
اور دہقان کے چھپر میں نہ بتی نہ دھواں
یہ بھی کیوں ہے یہ کیا ہے مجھے سوچنے دے
کون انساں کا خدا ہے مجھے سوچنے دے

جہاں تک بات اُن کے فلمی گیتوں کی ہے تو سارا زمانہ ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کا معترف ہے اس بارے میں کوئی دوسری رائے موجود نہیں۔ فلمی گیتوں پر جو شہرت اور عزت انہیں ملی وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ بطور نغمہ نگار اُن کا نام فلم کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ مرحوم قتیل شفائی کے ساتھ پاک ٹی ہاؤس میں مکالمے کا اہتمام کیا گیا۔ ہمارے دوست زاہد ہما نے سوال کیا کہ آپ کی پہچان بطور فلمی شاعر کے ہی کیوں بنی؟ آپ کی رائے جانا چاہتا ہوں، قتیل شفائی اس سوال پر سخت ناراض ہوئے کہ مجھے فلمی شاعر کیوں کہا گیا ہے۔

ساحر لدھیانوی کے ہاں صورتحال اس کے برعکس ہے۔ ایک اچھا فلمی شاعر ہونا ان کی تخلیقی زندگی کے ایک اور زاویے کو پیش کرتا ہے۔ ساری زندگی انہیں فلمی شاعر ہونے پر کوئی دفاعی بیان جاری کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ گیتوں کے ذریعے بھی وہ اپنے فکر کی ترویج کا کام لیا۔ مثلاً،

رات بھر کا ہے مہماں اندھیرا
کس کے روکے رکا ہے سویرا
تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا
یہ دنیا دو رنگی ہے
ایک طرف سے ریشم اوڑھے
ایک طرف سے ننگی ہے
عورت نے جنم دیا مردوں کو مردوں نے اسے بازار دیا
میں نے پی شراب تم نے کیا پیا-----
آدمی کا خوں
میں ذلیل ہوں--------تم کو کیا کہوں
یہ محلوں یہ تختوں یہ تاجوں کی دنیا
یہ انساں کے دشمن سماجوں کی دنیا
دولت کے بھوکے رواجوں کی دنیا
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے
ساتھی ہاتھ بڑھانا
ایک اکیلا تھک جائے گا مل کر بوجھ اٹھانا
ان کالی صدیوں کے سر سے جب رات کا آنچل ڈھلکے گا
جب دکھ بادل پگھلیں گے جب سکھ کا ساگر جھلکے گا
جب امبر جھوم کے ناچے گا جب دھرتی نغمے گائے گا
وہ صبح کبھی تو آئے گی
اک راستہ ہے زندگی جو تھم گئے تو کچھ نہیں
جو قدم کسی مقام پر جو جم گئے تو کچھ نہیں

الغرض ساحر کی شاعری کا بنیادی موضوع نظام زر کے خلاف بغاوت، محبت، امن، مساوات، برابری اور انسان دوستی کی عالمگیر خواہش کا اظہار ہے۔ ظاہر ہے، جیسا انسانی معاشرہ وہ دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ جاگیرداری قدروں اور سرمایہ دارانہ نظام معیشت کو شکست دیئے بغیر ممکن نہیں۔ لہذا ترقی پسند تحریک سے وابستگی کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنی تخلیقات میں جہاں نئے جہانوں کی دریافت، باطنی کیفیات کے بیان اور حسن و عشق کی ذاتی وارداتوں کی تشہیر پر زور دیتے ہیں۔ وہاں بطور ایک ذمہ دار شاعر و ادیب کے ہمارا یہ فرض بھی بنتا ہے کہ سیاسی و سماجی اور معاشی ناانصافیوں پر بھی قلم اٹھائیں۔ ایسا ادب تخلیق کریں جو سماج کو ارتقاء کے اگلے مرحلے میں لے جانے میں معاون ہو۔ اس یقین کے ساتھ کہ جو مصائب و آلام ہمارے حصے میں آئے وہ ہماری آنے والی نسلوں کا مقدر نہیں ہیں۔

خالق داد آریا

عبدالوہاب آریا/عبدالقیوم سربازی

بلوچی زبان و ادب کے آسمان پر جلوہ افروز ستارہ سرباز کے علاقہ کشدر (کجدر) میں 1939 میں پیدا ہوا۔

اس زمانے میں کشدر میں ایک پرائمری سکول تھا جہاں پر صرف چوتھی کلاس تک تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کے بعد اس نے مغربی بلوچستان کے سب سے بڑے شہر ایران شہر میں ہائی سکول سے کلاس ششم تک تعلیم حاصل کی اور سکول ماسٹر کے طور پر ملازمت کی ابتدا کی۔ اُس زمانے میں کلاس ششم سرکاری طور پر سکول ماسٹر کیلئے لازمی تھی۔

راسک اور کسر کند میں تدریس کے دوران اور کراچی کے سر چمگ کے نمائندہ کے طور پر سید ظہور شاہ ہاشمی اور عبدالصمد امیری کے دورے کے بعد آپ نے قلبی اور ذہنی طور پر محسوس کیا کہ وہ ابھی تشنہ علم ہیں۔ اسی عرض سے آپ نے محکمہ تعلیم کی نوکری سے استعفیٰ دیا اور مزید تعلیم کی جستجو میں تہران چلے گئے اور جلد ہی وزارت انتظامی امور یعنی وزارت داخلہ میں ملازم ہو گئے اور ساتھ ساتھ تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اور تہران یونیورسٹی سے زبان اور ادبیات فارسی میں ماسٹر ڈگری امتیازی نمبروں سے پاس کر لی اور میرجاوہ میں تحصیلدار مقرر ہو گئے۔

وہاں سے پھر گزوین میں تحصیلداری کی۔ دوران ملازمت ان کی کارگردی قابل تعریف تھی وہاں سے ترقی پا کر بندر عباس میں صوبہ ہرمزگان کے گورنر کے سکریٹری نامزد ہو گئے۔

تہران میں تعلیم اور انتظامی امور کی ملازمت کے دوران اُن کی ملاقات مختلف طائفوں کے بلوچوں سے ہوتی رہی جو تھران اور اس کے اطراف میں رہائش پریز تھے یا دوسرے صوبوں سے کام معاش یا دیگر ضروری امور کے سلسلے میں آتے رہتے۔ ان لوگوں میں ایک نمایاں شخص ڈاکٹر محمد بلوچ تھے۔

خالق داد آریا کو عالم و فاضل لوگوں سے حد سے زیادہ اُنسیت تھی۔ اس کے علاوہ پروفیسر صاحب کو علمی تحقیق اور جستجو کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے اُن علاقوں میں بسنے والے بلوچ طائفہ کے لوگوں کو تلاش کرنے اور ان کو نزدیک لانے میں خاصا کام کیا جن میں سے ایک اہم خاندان کے لائق اور ہونہار فرزند ڈاکٹر محمد بلوچ ولد حسین بلوچ تھے جو تہران یونیورسٹی کے انتہائی قابل پروفیسر اور ماہر حیوانیات تھے۔ وہ تہران یونیورسٹی کے شعبہ حیوانات کے اولین سربراہ تھے۔

بھٹو دور حکومت میں مشرقی بلوچستان میں میر غوث بخش بزنجو صاحب گورنر بلوچستان تھے سردار عطاء اللہ خان مینگل کی حکومت تھی۔ جب میر غوث بخش بزنجو ایران کے سرکاری دورہ پر آئے تو میر کریم بخش سعیدی پارلیمنٹ کے ممبر سے انہوں نے راہنمائی کیلئے پروفیسر خالقداد آریا سے مدد لی۔ اور میر غوث بخش بزنجو کے دورے کے ابتدا سے لے کر الوداعی وقت تک پروفیسر خالقداد آریا کو ساتھ رکھا۔ کیونکہ پروفیسر آریا ہی واحد شخص تھے جن کی سوچ بوجھ اور دانش سب سے سوا تھی۔ انہوں نے بلوچستان کے دونوں اطراف کے لوگوں کی بہتری کیلئے بہت ساری تجاویز میر غوث بخش بزنجو کے مشورہ پر حکومت ایران کو دی لیکن بھٹو حکومت کی غلط پالیسیوں اور پاکستان کے عسکری حلقے کی مداخلت کے سبب پروفیسر آریا تجاویزات پر عمل نہ ہو سکا۔

خمینی انقلاب کے بعد پروفیسر خالقداد آریا زاہدان کے کمشنر (فرماندار) اور بندر عباس کے گورنر رہ چکے اور ریٹائرمنٹ کے بعد تہران میں مقیم رہے۔ تھران میں قیام کے دوران اپنے دیرینہ دوست پیر محمد ملازہی اور کچھ دوسرے بلوچوں کے مشورہ سے ایک انجمن کی بنیاد رکھی جس کا نام انجمن بلوچاں تھران رکھا۔

جناب پروفیسر خالقداد آریا کی ادبی خدمات قاچار بادشاہوں کے دور کے کتب کو کنگھال کر بلوچ اور بلوچستان کے متعلق تمام مواد جمع کر کے ان کو کتب کی صورت میں قلمبند کر کے چھپوایا

جغرافیہ و تاریخ بلوچستان

رسالہ غفاری

جغرافیہ بلوچستان تحریر افضل الملک

ان کو ضخیم رسالہ کی شکل میں چھپوایا۔ رسالہ کا نام فرہنگ ایران زمین. 29,28

بلوچی اور پہلوی کے ہم آہنگ الفاظ کو آمنا سامنا کر کے لغت کی شکل میں ترتیب دیا جس کے ایک حصے کو جناب استاد اشرف سربازی نے بلوچی فارسی میں ماہتاک بلوچی شائع کروایا۔

بلوچی زبان کے شعراء، ادبا، دانشور اور دیگر استادان گرامی حضرات نے جتنے بھی خطوط ارسال کیے۔ ان خطوط کے اہم حصے کو کتابی شکل میں تیار کر رکھا ہے (چھپائی کیلئے تیار ہے۔) حانی و مرید، شہداد و مہنار اور دیگر کئی اشعار عرق ریزی سے جمع کیے۔ اس کے علاوہ قدیم اشعار کی تلاش اور باز یافت کیلئے سینکڑوں میل کی مسافرت کرتے رہے۔ اس شخص تک پہنچنے کیلئے وہ اپنی انتھک کوشش کرتے اور مطلوبہ گوہر مراد حاصل کر لیتے۔ ایک مشہور شعر جو ''تو لگ شعر'' کے نام سے معروف ہے اس کی تلاش میں رہے۔ لیکن کسی طرز پر بھی ایسا بندہ نہیں ملا جسے یہ شعر اصلی لفظوں میں یاد ہو۔ بہت تلاش اور جستجو کے بعد معلوم ہوا کہ ایک شخص بنام دلمراد کو یہ شعر حفظ ہے۔ وہ اس کی ٹوہ میں رہے۔ آخر معلوم ہوا کہ وہ شخص جیل میں قید سزا کاٹ رہا ہے۔ پروفیسر خالقداد آریا نے عدالت سے خصوصی اجازت نامہ لے کر جیل میں

اُس بندے سے ملاقات کی اور اُس کی آواز شعر کے قالب بذریعہ ٹیپ ریکاڈر محفوظ کیا۔

خمینی انقلاب 1979 کے بعدانہوں نے ایک رسالہ بنام ''ماہتاک مکران '' شائع کیا۔ ابھی صرف دو ہی شمارے چھپ چکے تھے کہ حکومت نے بندش لگادی۔ انہوں نے وزارت اطلاعات کو عرضی دی حتیٰ کہ نام تبدیل کر کے ماہنامہ بلوچی کا ڈیکلیریشن مانگا لیکن وزارت اطلاعات نے اجازت نہیں دی۔ انہوں نے رسالہ کیلئے عمر کے آخری دنوں تک جدوجہد کی تاکہ اس خطے میں اپنی قومی زبان کے رسالہ کا اجرا ہو مگر وہ اپنی کوشش میں نامراد رہے ۔ فارسی ادب کے خرمنگستان اور مرکز دارت المعارف بزرگ اسلامی ایران میں بلوچی ادب اور زبان کے تمام مواد کو صحیح کرنے میں مدد گار رہے اور بلا معاوضہ کام کرتے رہے۔ اسی مرکز میں انہوں نے بلوچی ادب کو یکجا کر کے ان سے کہا کہ اس کا نام تاریخ بلوچستان رکھ دی جائے لیکن ادارہ کے دیگر فارسی ادیب جو کہ سرکاری پالیسی کے تحت کام کر رہے تھے انہوں نے تاریخ بلوچستان کا نام رد کر کے فیصلہ کیا کہ اس کا نام بلوچ تاریخ فرہنگ رکھ دیں ۔ اب تک یہ کتاب شائع نہیں ہوئی۔

پروفیسر خالقداد آریا تحقیق اور جستجو بلوچی ادب تاریخ ثقافت کے لیے مشرقی بلوچستان بھی تشریف لے گئے۔ کوئٹہ میں عبداللہ جان جمالدینی ، عطا شاد عبداللہ بلوچ اور دیگر ادباؤ شعر تاریخ دان اور دانشوروں سے ملاقات کی اور تبادلہ خیالات کیا۔

کراچی میں بھی تشریف لے گئے اور وہاں زبان و ادب سے وابستہ لوگوں سے ملے۔ بقول پروفیسر خالقداد آریا یہ دور ے علم وادب کیلئے انتہائی اہم رہے ۔تھران میں بلوچی ادب تاریخ جغرافیہ سے تہذیب ثقافت اور موسیقی سے متعلق جتنے بھی لوگ آتے آریا ان لوگوں کی ہر طرح سے رہنمائی خدمت اور مہمان نوازی کا فرض احسن طریقے سے سرانجام دیتے۔ان کی خوش اخلاقی اس حد تک ہوتی کہ آنے والا یوں محسوس کرتا جیسے وہ اپنے گھر اور احباب کے درمیان ہے۔

تھران میں بلوچی زبان کی ہر محفل میں وہ روز اول سے شامل رہے گویا ان کے بغیر دیوان نا تکمیل ہے ۔قومی خدمت کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ ایک وفادار بلوچ تھے جو اپنے فرض سے کوتاہی یا غفلت کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے بلوچستان میں زبان وادب کی کسی بھی مجلس کے بارے میں انہیں اطلاع ملتی وہ ہمیشہ اپنی خدمات پیش کرتے۔ بلوچی ادب کی آبیاری میں ان کا اہم مقام رہا ہے۔اُسی کی بیکراں محبت اور حوصلہ افزائی کے سبب مغربی بلوچستان کے دور دراز علاقوں میں ادبی جنبش کی آبیاری ہوئی۔اُن کے دوست اور رفقاء کی بڑی تعداد اپنی اپنی استعداد کے مطابق زبان وادب کی خدمت میں حصہ ڈال رہے ہیں۔

پروفیسر خالقداد آریا کا تعلق مغربی بلوچستان کے زرخیز اور شاداب خطہ سرباز سے تھا۔ یہ خطہ ہمیشہ سے علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ پروفیسر نے اپنی زندگی کے آخری لمحات بھی سرباز میں گزارے۔ وفات کے وقت وہ اپنے آبائی گھر کجدر سرباز میں تھے۔ بہانہ حرکت قلب بند ہو جانا ہوا ۔ آپ کی وفات 3اپریل 2011 کو ہوئی۔

امن کے گیت

شاعر: احمد مقداد (فلسطینی شاعر استاد اور ایکٹوسٹ ہیں)
انگریزی سے اردو ترجمہ سلمیٰ جیلانی

امن کے گیت
ارض مقدس پر آہستگی سے پھیلتے ہوئے،
دھیرے سے مسجد سے ابھرتی اذان سنو
امن کے گیت کے طور پر۔

معجزاتی، چرچ کی گھنٹیاں بج رہی ہیں،
پرانے شہر کے اطراف میں،
شادمانی کا احساس جگاتی دعا
امن کے گیت کے طور پر۔

ذرا غور سے دیکھو
ادھر شمالی پہاڑوں سے پرے
پتنگیں اڑاتے ہوئے بچے
اچھلتے شور مچاتے ،دل میں آزادی کی تڑپ لیے
امن کے گیت کے طور پر۔

جفاکش کسانوں کے ہاتھ سے لگائے ہوئے
زیتون کے درختوں کے سرسبز باغوں کی چھاؤں،
آنے والی نسلوں میں
امید جگاتی ہوئی
امن کے گیت کے طور پر

گواہ رہنا ،آزادی کی جدوجہد کرنے والے مجاہد
چوری کی گئی خون میں ڈوبی
سرحدوں کے قریب،
فلسطینی پرچم بلند کر رہے ہیں
بہادری ان کی اس قربانی میں
امن کے گیت کے طور پر۔

سنو! چڑیاں سرخوشی میں چہچہاتی ہیں
پھولوں سے لدی شاخوں پر
ان کے نغمے
خوشیوں کی لے سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے،
امن کے گیت کے طور پر۔

آؤ استقامت سے یکجا ہو جائیں،
اور فلسطین کی آزادی کا گیت گائیں
پیار اور سکوں کو پھیلا کر
امن کے گیت کے طور پر۔

ہجوم کے ہاتھوں ہلاکتوں کی تاریخ

مہ ناز رحمان

پاکستان میں لوگوں کو قانون کو ہاتھ میں لینے اور عدالتوں میں ملزم کو پیش کرنے کی بجائے ہجوم کی صورت میں اسے جان سے مار دینے کے واقعات کافی تعداد میں ہوتے رہے ہیں۔

Foreign affairs review insights and کی تحقیق کے مطابق پاکستان میں مذہب کے نام پر لوگوں پر تشدد کرنا ایک عام سی بات ہے۔ گو کہ توہین مذہب کے قانون کے تحت ابھی تک کسی کو پھانسی نہیں ہوئی ہے لیکن 1990 سے 2023 کے دوران ستر 70 سے زیادہ افراد توہین مذہب کے الزام میں ہجوم کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر چکے ہیں۔

سب سے زیادہ ہائی پروفائل کیس سری لنکا کے شہری پریانتھا کمارا کا ہے جو سیالکوٹ کی ایک گارمنٹ فیکٹری میں مینجر تھا اور 3 دسمبر 2021 کو اس پر توہین مذہب کا الزام لگا کر مار دیا گیا اور پھر سڑک پر اس کی لاش کو آگ لگا دی گئی۔ اس واقعے کی بدولت دونوں ملکوں کے درمیان سفارتی بحران پیدا ہوگیا اور دنیا بھر میں غم وغصہ کا اظہار کیا گیا چنانچہ بڑے پیمانے پر تحقیقات کے نتیجے میں 89 لوگوں کو گرفتار کیا گیا اور بالآخر ان میں سے چھ کو موت کی سزا سنائی گئی۔

اس سے پہلے 13 اپریل 2017 کو مشال خان کا واقعہ پیش آیا تھا۔ مشال مردان کی عبدالولی خان یونیورسٹی میں شعبہ صحافت کا طالب علم تھا۔ اسے طلبہ کے ایک گروہ نے وحشیانہ تشدد کر کے قتل کر دیا تھا۔ یہ واقعہ بھی اپنی ظالمانہ نوعیت کی وجہ سے دنیا بھر کی توجہ کا مرکز بنا۔ مشال اپنے ترقی پسند نظریات کی وجہ سے جانا جاتا تھا۔ اس کیس میں 61 افراد کو گرفتار کیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک کو سزائے موت، سات کو عمر قید اور پچیس کو چار سال قید کی سزا سنائی گئی جب کہ 26 کو چھوڑ دیا گیا۔

ڈان اخبار کی رپورٹ کے مطابق نومبر 2014 میں لاہور کے قریب کوٹ رادھا کشن میں ایک مسیحی جوڑے کو ایک ہجوم نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس واقعے نے پاکستانیوں اور باقی دنیا کو ہلا کے رکھ دیا۔ ایک قابل مذمت اور دل دہلا دینے والا واقعہ ہونے کے باوجود پاکستان میں یہ کوئی حیران کن واقعہ نہیں تھا۔ مارا جانے والا جوڑا شمع اور شہزاد تین بچوں کے والدین تھے اور شمع کو چار مہینے کا حمل تھا۔ بعد میں ہجوم نے ان کی لاشوں کو اینٹوں کے بھٹے میں پھینک کر جلا دیا تھا۔ دونوں میاں بیوی اسی بھٹے پر بانڈڈ لیبر کے طور پر کام کرتے تھے۔

پاکستان اور بنگلہ دیش لوگوں کے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے اور ہجوم کے تشدد کی وجہ سے بدنام ہیں۔ پاکستان میں کرسچن، ہندو اور دیگر اقلیتیں اپنے پڑوسیوں سے خوف زدہ رہتی ہیں کیونکہ توہین مذہب کے الزام میں عدالت نہیں تو ہجوم ضرور انہیں موت کی سزا دے سکتا ہے۔ سعودی عرب میں سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں مجرم کا سرتن سے جدا کیا جاتا ہے۔ ایران میں سرعام پھانسی دی جاتی ہے۔ دنیا بھر میں پھانسی کی سزا سب سے زیادہ چین میں اور اس کے بعد ایران اور سعودی عرب میں دی جاتی ہے۔ جب کہ ضیا الحق کے دور میں سیاسی کارکنوں کو سر عام اور صحافیوں کو جیل میں کوڑے لگائے گئے۔ اس طرح کی سزائیں پورے معاشرے کو تشدد پر آمادہ کرتی ہیں۔

NUST کے پی ایچ ڈی اسکالر خورشید علی سنگے نے ہجوم کے ہاتھوں قتل پر تحقیق کے لئے 2014 سے 2017 تک کے انگریزی اخبارات کا جائزہ لیا تو ہجوم کے ہاتھوں قتل کے 22 واقعات سامنے آئے۔ پنجاب میں سات، اربن سندھ، کراچی اور حیدرآباد میں 11، دیہی سندھ میں صفر، کے پی کے میں تین اور بلوچستان میں ایک واقعہ پیش آیا۔ اس میں زخمی ہونے والے یا پولیس کی بروقت مدد سے بچ جانے والے شامل نہیں ہیں۔

ان کی تحقیق کے مطابق ہجوم کے ہاتھوں قتل تین صورتوں میں ہوتا ہے۔ یا تو کوئی چوری کر کے یا پرس یا کوئی اور قیمتی چیز چھین کر بھاگنے والا یا اغوا کار ہجوم کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ یا ہجوم کسی شخص کے بارے میں توہین مذہب کا الزام سن کر مشتعل ہو کر اسے مار ڈالتا ہے۔ یا جنسی زیادتی کے الزام پر کسی کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ پہلی وجہ کی بنا پر اس عرصے میں 15 لوگوں کو ہلاک کیا گیا۔ مذہبی وجوہات کی بنا پر 5 کیسز سامنے آئے۔ جب کہ صنفی اور جنسی حوالے سے دو کیسز سامنے آئے۔ پنجاب میں مذہبی بنیادوں پر مارے جانے کے سب سے زیادہ واقعات کرسچن کمیونٹی اور اس کے بعد قادیانیوں کے ساتھ پیش آئے۔ بعض مرتبہ مسلمانوں پر بھی توہین مذہب کا الزام لگا کر مار دیا جاتا ہے۔ اربن سندھ میں چوری یا موٹر سائیکل وغیرہ چھین کر بھاگنے والوں کو مار دیا جاتا ہے۔

بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی اور یونیورسٹی آف ایمسٹرڈیم نیدرلینڈ کے ایم آصف، ڈی وینک اور پیٹر میسینی کی تحقیق کے مطابق مشال خان اور کوٹ رادھا کشن کے شمع اور شہزاد جن

کے کیسز کا اوپر ذکر ہو چکا ہے کے علاوہ مارچ 2015 میں یوحنا باد میں کرسچن چرچز پر بم حملوں کے الزام میں ہجوم نے بابر نعمان، اور حافظ نعیم کو مار کے جلا دیا۔ جولائی 2012 میں ضلع بہاولپور کے چانی گوٹ ٹاؤن میں غلام عباس کو قرآن پاک کی بے حرمتی کے الزام میں ہجوم نے جلا دیا۔ اگست 2010 میں سیالکوٹ میں دو بھائیوں مغیث اور منیب کو ہجوم نے ڈکیتی کے الزام میں مار ڈالا۔ اپریل 2017 میں چترال کی شاہی مسجد میں نماز جمعہ کے دوران توہین مذہب کا الزام لگایا گیا لیکن امام نے اسے ہجوم سے بچا کر پولیس کے حوالے کر دیا۔ مارچ 2013 میں لاہور میں بادامی باغ میں ایک کرسچن ساون مسیح پر توہین مذہب کا الزام لگایا گیا۔ اسے بھی پولیس نے بچا لیا لیکن مشتعل ہجوم نے کرسچن کمیونٹی اور وہاں کے رہائشیوں پر حملے کئے۔ رائٹر کے مبشر بخاری کے مطابق فروری 2023 میں ننکانہ صاحب میں محمد وارث نامی ایک نوجوان پر ہجوم نے قرآن مجید کی بے حرمتی کے الزام میں حملہ کر دیا لیکن پولیس نے اسے بچا کر تھانے میں بند کر دیا مگر ہجوم نے تھانے پر حملہ کر دیا اور اسے باہر لا کر مارنے کے بعد اس کی لاش کو جلانے کی کوشش کی۔ مگر جب تک پولیس کی مزید نفری وہاں پہنچ گئی اور ہجوم لاش کو جلا نہیں پایا۔

6 مئی 2023 کو ریڈیو فری یورپ/ ریڈیو لبرٹی کے مطابق پاکستان کے شمال مغربی حصے میں ایک مشتعل ہجوم نے ایک مقامی مولوی پر ایک سیاسی ریلی میں توہین مذہب کے الزام میں حملہ کر دیا۔ اور اسے جان سے مار دیا۔

بی بی سی کی ایک رپورٹ کے مطابق 2014 میں ایک مشتعل ہجوم نے گوجرانوالہ میں احمدیوں کے گھروں پر حملہ کر دیا۔ مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ جھگڑے کی ابتدا کرکٹ کے کھیل سے ہوئی لیکن جھگڑا بڑھا تو ایک نوعمر احمدی لڑکے پر توہین مذہب کا الزام لگا دیا گیا اور سینکڑوں کے ہجوم نے احمدیوں کے ایک درجن سے زیادہ گھروں کو آگ لگا دی۔ تین بچیاں اور ان کی دادی جل کر مر گئیں۔

توہین مذہب کے الزام می ہجوم میں ہاتھوں مارے جانے کے معاملے میں صرف ایک ملک پاکستان سے آگے ہے اور وہ ہے نائیجیریا۔ ایسے واقعات کی روک تھام کے لئے قانونی اور پالیسی اقدامات کرنے ہوں گے۔ ایسے الزامات کی موثر اور شفاف طریقے سے تحقیقات کی جائے اور جھوٹا الزام لگانے والے اور ملزم کو جان سے مار دینے والوں کو قانون کے مطابق سخت سزائیں دی جائیں۔

عالمی یوم خواتین 8 مارچ

لالہ رخ لالہ

بھری دنیا کی محفل ہے
یہ عورت کی بدولت ہے
یہ عورت کا تمدن ہے
یہ عورت کی روایت ہے
سماجی قدر کی پہلی اساس فن بھی عورت ہے
کہ کرب روح سہتی ہے
یہ رشتوں میں بٹی ہر غم اٹھاتی ہے
یہ بربط ہے
سبھی تانیں گداز وسوز کی من میں سموتی ہے
گھنی چھاؤں کی راحت میں بساتی ہے
اسی کی برق خنداں سے درودیوار ہنستے ہیں
اسی کی خاک سے حسن ومسرت کے سبھی نغمے اگتے ہیں
یہ عورت فرد ہے
عقل وخرد ہے
نفس کامل ہے
محبت ہے، عنایت ہے، لطافت ہے، حلاوت ہے
یہ راحت ہے، حرارت ہے، نظارت ہے، نفاست ہے، مروت ہے، مشقت ہے، ریاضت ہے، نظامت ہے، لیاقت ہے
خدا کو بھی مثال عشق میں اک ماں ہی دکھتی ہے
ذرا سوچو!
اسی کے خون سے تشکیل پاتے ہو
اسی اک مہرباں ہستی سے تم منسوب رہتے ہو
مگر جب تم توانائی کے جوہر سے دمکتے ہو
اسی کو روند دیتے ہو
وفا کی دھجیاں پل میں اڑاتے ہو
لہو اس کو رلاتے ہو
وجود زن سے ٹوٹے اک شرر سی جان ہو پھر بھی
عجب ہے یوں گرجتے ہو
کہ بے مایہ سمجھتے ہو
سنو احمق! سنو ناداں!
اسی کے دم سے قدرت نے تمہیں ہستی نوازی ہے
تمہیں جینا سکھایا ہے
تمہیں طاقت عطا کی ہے
کرو عزت کہ محسن یہ تمہاری ہے
اسے انساں کبھی سمجھو
مقام خلق بھی جانو
ستم اپنے بھی پہچانو
کرو گے قتل عورت کو اندھیرے تم پہ چھائیں گے
خوشی تم سے بھی روٹھے گی
مسرت روشنی تاریکیوں میں ڈوب جائے گی
کہیں الفت نہیں ہوگی
کہیں چاہت نہیں ہوگی

غوث بھار

بشیر بیدار

بقول ئے شائر، مدام تو گیر کائے مردمےءَ۔ باور بکن تو ھر وھدءَ من ءَ گیر کائے۔ تئی زبان، ادب ءِ راج دوستی چہ کس ءَ چیرءِ اندر نہ اَنت۔ بلے تو ھما بُوٹ ئے کہ ھچ پادافِٹ نہ بئے۔ ھر دَورءَ دل پھکیءِ راست گوشی زنڈیں رَدے لیگگ بیت۔ انگت ہے وڑا اِنت۔ بلوچی زُبان ءِ نبشتہ یا لکھ وڑئے رھبند گوں من ءَ گوں تو رِگیشینگ نہ بیت۔ اے جیڑہ ھما وھدا رِگیشیت کہ راج وتی واجہ وت بیت البت رومن رھبند ءِ تہ ءَ اے جیڑہ گیش ءِ گیوار بوت کنت۔ بلے پدا ھم وت واجھیءِ وت مستری الّمی اِنت۔

بکتاورتو گوں وتی جندءِ نام ءَ رِگرءِ دار ءَ گیش نئے۔ برئے غوس بھار ءِ برے گوس بھار۔ سید ھاشمی کہ اے رھبند ءِ بُن ھِشت اریِ کنوک بوتگ۔ آئی ءِ ھم وتی نام زھور شاہ ھاشمی نبشتہ نہ کتگ۔ ما اگاں ع، غ، ط، ظ، ص، ض، ف، ءِ خ ءِ آب یا حرفاں چہ بلوچی ءَ بہ کشّیں گُڑا مری ءِ بگٹی آں چون کنیں۔ بلوچ تھنا مکّرانی اَنت؟ یا زبان تھنا مکّران ءِ مردمانی اینت۔ 1972ءِ 1973 ءَ نیپ سرکار ءَ ماں شالکوٹ ءَ لینگویج کانفرنس یے لوٹائینت۔ کانفرنس ادبی ءَ چہ زیات سیاسی اَت۔ کانفرنس ءِ مکسد بلوچی زبان ءِ عربی رھبند ءِ بدل ءَ رومن نبشتہ کنگ بہ بیت۔ بلے نیپ ءِ سرکار چو شدّادی بھشت ءَ بوت۔ نُھ ماہ ءَ چہ رند نیپ ءِ بُنڈک بال دئیگ بوتنت۔ بائد اے کارءَ مئے اکیڈمی ءِ علمی ادارہ بکن اَنت۔ مئے اکیڈمی چہ وتی لاپ ءِ سنگتانی چیزّے کتاب ءِ چاپ کنگ ءَ گیش نہ اَنت۔ ھما اکیڈمی، ماھتاک، قلمکارءِ شائر کہ نیشنل پارٹی ءِ ڈاکٹر مالک ءِ بُت ءِ دُژمن بوتگنت۔ آھانی فنڈ ءَ چہ ھزار ءَ لکّ ءِ کروڑ زیات کنگ بوتگنت۔ ھما شائر ءِ قلمکارانی کتاباں ڈاکٹر مالک چاپ ءِ شنگ کنگ ءَ اِنت کہ آھاں چہ ڈاکٹر مالک ءِ نام ءَ نفرت بوتگ۔۔۔

ڈاکٹر مالک دانائیں مردمے عمر ئِے کسان اِنت، بلے عقل ئِے مزن اِنت۔ پیپلز پارٹی والا گوشنت جمہوریت بہترین انتقام ہے، ڈاکٹر مالک ہم سر پد اِنت کہ دپ ءِ بندگ بہترین انتقام ہے۔ بھار جان! بلوچاں گوشتگ، درکدئِے اولاک ءَ بجن بار ءَ۔ کاھلے بور ءُ راھلے برو۔

۔۔۔

(7فروری 2015 کراچی)

***

پروفیسر ڈاکٹر ضیاالرحمٰن کبدانی

امانت حسرت

رخشان ڈویژن کے ضلع خاران سراوان روڈ پرایک گاوں کلی تمپ پروفیسر ڈاکٹر ضیاالرحمٰن کبدانی کی جائے پیدائش ہے۔ جہاں وہ 20 جنوری 1979 میں یار محمد کبدانی کے ہاں پیداہوا ابتدائی تعلیم اپنے علاقے سے حاصل کی اور پھر 2003 بلوچستان یونیورسٹی سے ایم اے بلوچی میں گولڈمیڈل حاصل کی ۔بعد ازاں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی اعلی ڈگری حاصل کرنے میں بھی کامیاب رہا۔ اس ان کی پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ بلوچی اور پشتو زبان کے لسانی ہم آہنگی کے مطالعہ سے متعلق ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر ضیاالرحمٰن کبدانی ان چند شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں جنہیں اپنے مضمون کے ساتھ والہانہ محبت اور تندہی سے کام کرنے کی عادت ہے ۔ ڈاکٹر ضیا الرحمٰن کبدانی کی یہ خوبی اسے ممتاز کرتی ہے کہ خود بھی بلوچی زبان وادب کی ترویج وترقی تحقیق ونگارشات میں دلچسپی رکھتا ہے ۔ پروفیسر ڈاکٹر ضیا الرحمٰن کبدانی اس وقت علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر خدمت انجام دے رہاہے ۔ اور وہیں سکونت پذیر بھی ہے ۔اسلام آباد جیسے جدید شہر میں بلوچستان کے چٹیل میدانوں ، لق دق صحراہوں اور بے آب وگیاہ پہاڑوں سے ہزاروں طلباء کے اعلی تعلیمی حصول کے لیے پروفیسر ڈاکٹر ضیا الرحمٰن کی موجودگی کسی غنیمت سے کم نہیں جو نہ صرف ہمارے طلباء و طالبات کی مختلف معاملات میں رہنمائی کرتے ہیں بلکہ ان کے ساتھ ہرطرح کے تعاون اور ہمدردی کے لیے بھی ہمہ وقت دستیاب رہتے ہیں۔ ان کی نگرانی میں اس وقت 27 سے زائد طلبا وطالبات اپنے ایم فل کی ڈگری مکمل کر چکے ہیں اور قریبا سات ، آٹھ ایسے طلبا وطالبات ہیں جن کا تحقیقی کام ہنوز تک جاری ہے آپ کونمایاں اور اپنے شعبے میں اعلی خدمات اور ملکی وبین القوامی سطح کے سیمینارز میں پاکستانی زبانیں اورادب کی نمائندگی کے حوالے سے کئی عزازات سے نوازا گیا اس کے علاوہ وہ بلوچستان ایجوکیشنل اینڈ کلچرل آرگنائزیشن کے صدر کی حیثیت سے اسلام آباد میں بلوچی اور براہوئی زبان وادب کی ترویج وترقی کے خدمات انجام دے رہا ہے ۔اللہ تعالی نے پروفیسر ڈاکٹر ضیاالرحمٰن کوجن ادبی ،ثقافتی اور علمی وقلمی صلاحیتوں سے نوازاہے ان صلاحیتوں کوانھوں نے ہمیشہ اپنی منکسرانہ خو اور طبعیت سے جوڑے رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی خوش طبعی اورملنساری وصحبت برداری میں یکساں مقام ومنزلت نظر آتا ہے۔ اس کا حلقہ اثر ثقافتی اورلسانی محققین سے وابستہ ادیبوں اور اہل قلم سے منسلک ہے۔ آپ خاندانی اورگھریلو روزمرہ زندگی میں بلوچی اوراردوزبان میں گفتگوکرتے ہیں جبکہ براہوئی زبان میں بات چیت کرنے کے علاوہ پشتو بھی روانی کے ساتھ بولتے ہیں۔۔

رسالہ عوامی جمہوریت

ڈاکٹر شاہ محمد مری

6 مئی 1972 کا شمارہ بھی بھٹو کی سیاست و معیشت کی سراسر مخالفت کا شمارہ ہے ۔ اس کے علاوہ اس میں مختلف جگہوں پر پاکستان سوشلسٹ پارٹی کی سرگرمیوں کی رپورٹیں ہیں۔ ایک مضمون لینن کی زندگی اور جدوجہد پر ہے ۔ اسی طرح ''ایران میں انقلابی جدوجہد'' کے عنوان سے ایک معلوماتی مضمون اس شمارے کی زینت ہے ۔ اس شمارے کا آخری صفحہ ''پولیٹیکل اکانومی'' کے عنوان سے قسط وار چلنے والے مضمون کی اگلی قسط ہے۔

ہفت روزہ عوامی جمہوریت کا اگلا شمارہ مکمل طور پر جشن و تہوار کے موڈ میں ہے ۔ بھر پور مسرت کے جذبے میں۔اور اُس کی وجہ بھی رسالے نے خود ہی اپنے اوپننگ فقرے میں بتائی:'' پاکستان میں گذشتہ 25 برسوں سے مزدور ہر سال یوم مئی مناتے ہیں۔ لیکن اس سال حکومت نے یکم مئی کو تعطیل کا دن قرار دے دیا۔ اور پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت نے اسے سرکاری طور پر بھی منایا''۔

یہ تھی بھی جشن کی بات۔ پہلی بار ہمارے رجعتی اور مارشل لا زدہ اور فاشسٹ منش وطن میں سرکاری طور پر محنت کشوں کے عالمی دن کو منانے کی ''اَنہونی'' بات ہو رہی تھی۔ یہ بات تو صرف اُن لوگوں کی سمجھ میں آسکتی ہے جو ضیازدہ معاشروں میں رہتے رہے ہوں۔ یہ واقعی مسرت وانبساط کی بات تھی۔مگر اخبار نہ تو پیپلز پارٹی میں بھرتی ہوتا ہے اور نہ اُس کی دوسری پالیسیوں پہ تنقید روک دیتا ہے۔ اخبار نے بہت ہمت اور وضاحت کے ساتھ سرکار سے ایک طرح کا فاصلہ رکھا:''لاہور میں بیشتر ٹریڈ یونین لیڈروں اور سرکاری سوشلسٹوں نے حکومت کے ساتھ مل کر اِس دن کو منایا اور اس طرح مزدور طبقے کے طبقاتی شعور کو کُند کیا اور انہیں سرمایہ دار طبقے کی جھولی میں ڈالنے کا کام کیا''۔

کبھی کبھی نام نہاد انقلابیوں کی حرکتوں پہ واقعی حیرت ہوتی ہے ۔ عوامی جمہوریت کے اسی شمارے میں بتایا گیا کہ ''سرکار نے گورنر پنجاب مصطفےٰ کھر کی قیادت میں جلوس نکالا جس میں لیبر لیڈر ربشیر بختیار ، مرزا ابراہیم، مزدور کسان پارٹی، پاکستان ورکرز پارٹی، این ایس او اور این ایس ایف بھی شامل تھے''۔۔۔۔ لاحول والاقوت۔

اخبار میں آج سے پچاس برس قبل اس یومِ مئی کے جلوسوں جلسوں میں مزدوروں کی تنظیموں اور اُن کی سیاسی پارٹی کے لگائے جانے والے نعرے بھی چھاپے۔ مجھے دلچسپی پیدا ہوئی کہ اپنے قارئین کو بھی بتایا جائے کہ پچاس سال میں کیا کچھ تبدیل ہوا۔

* چھین لو چھین لو، جاگیریں چھین لو
* امریکی سامراج مردہ باد
* لیبر پالیسی تبدیل کرو
* ہڑتال کا غیر مشروط حق تسلیم کرو
* کارخانے مزدوروں کی تحویل میں دو
* امریکیو! ویٹ نام سے نکل جاؤ
* ویٹ نامی عوام زندہ باد
* امریکیو! ایشیا سے نکل جاؤ
* مزدور کسان اتحاد زندہ باد
* دنیا کے محنت کشو ایک ہو جاؤ
* شکاگو کے شہید زندہ باد
* پاکستان کے مزدورو ایک ہو جاؤ
* امریکی سرمایہ ضبط کرو
* اجارہ دار صنعتیں قومی ملکیت میں لو۔

اس کے علاوہ اس شمارے میں لینن پہ ایک جامع مضمون موجود ہے ۔اس کے علاوہ ایک اچھا معلوماتی مضمون ''ایران میں انقلابی جدوجہد'' کے عنوان سے شامل ہے ۔ ایک مضمون پیپلز پارٹی کی طرف سے مارشل لا کے قائم رکھنے کے خلاف لکھا گیا ہے ۔ علم المعیشت کی 17 ویں قسط بھی شمارے میں ہے۔

''عوام دشمنی کا مظاہرہ''

20 مئی 1972 کے شمارے کے اہم مضمون کا عنوان ہے ۔ یہ اس لیے ہے کہ بھٹو حکومت نے پاکستانی کرنسی کی قیمت گھٹا دی ۔ بورژوا دانشوروں اور ''لُوسی'' (یعنی پیٹی بورژوا) انقلابیوں کی طرف سے سرکار کی جانب سے اس اقدام کے حق میں وہی گھسے پٹے دلائل دیے گئے تھے جو آج پچاس برس بعد کے دانشور دے ہے ہیں ۔ جہازی سائز کے پورے دو صفحے اس مضحکہ خیز حرکت کے خلاف وقف کیے گئے ۔میں یہاں وہ دلائل نہیں دوہراؤں گا، اس لیے کہ بعد میں ہر حکومت، جی ہاں ہر حکومت روپے کی قیمت گھٹاتی رہی اور اُس کے ''ماہرین'' وہی بیکار دلائل دوہراتے رہے ہیں۔

اِس شمارے کا اداریہ بھٹو حکومت کی لیبر پالیسی کو مزدور دشمن پالیسی قرار دے کر لکھا گیا۔ ایک فکری مضمون ''لینن اور طلبا'' کے عنوان سے ہے ، جس میں طلبا کو سیاسی طور پر باشعور بنانے اور انہیں سیاسی پارٹی کی تنظیم میں پرونے کی بات کی گئی۔

حسبِ سابق پولیٹیکل

اکانومی کی اگلی قسط اِس شمارے میں موجود ہے۔

27 مئی 1972 کا بڑا مضمون تو ''جدید نوآبادیاتی نظام کا مرقع'' کے عنوان سے ہے۔ یہ مضمون انڈونیشیا کی معیشت وسیاست پر ہے۔ وہاں حکومت نے کمیونسٹوں کا قتل عام کیا تھا۔ اور اس کے عوض امریکی سامراج اور اُس کے ادارے اُس ملک پہ مہربان ہوگئے۔ اور امریکہ کی کسی ملک پہ مہربان ہونے کا مطلب ہی اُس ملک کی بربادی ہوتا ہے۔ چنانچہ ورلڈ بنک نے اُسے جدید نوآبادیاتی نظام کا اہم حصہ بنا کر رکھ دیا۔ قرضوں میں جکڑا جانا ایسی پالیسی کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ دن اور آج کا دن انڈونیشیا نے حقیقی خودمختاری پھر نہ دیکھی۔

مگر مجھے اخبار کی طرف سے جارجی دیمتروف کے 90 ویں یوم پیدائش کی یاد منانا زیادہ اچھا لگا۔ یہ شمارہ 27 مئی کا تھا اور دیمتروف کی سالگرہ 18 جون کو آنی تھی۔ مضمون کا عنوان ہے : جارجی دیمتروف اور مزدور تحریک۔

دیمتروف نے اپنی زندگی کی شروعات پرنٹنگ پریس میں بطور مزدور کام کرنے سے کی تھی۔ وہاں ٹریڈ یونین تحریک میں شامل ہوکر وہ آگے بڑھتا رہا۔ یہ مضمون گویا ٹریڈ یونین کی عالمی تحریک کا ایک اجمالی جائزہ ہے۔ اُس نے صحافت کے شعبے میں بہت کام کیا۔ دیمتروف فاشزم کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ اس کی تحریک اور اس کی تحریریں فاشزم کی چیرہ دستیوں کے خلاف رہیں۔

اس شمارے میں پاکستان سوشلسٹ پارٹی اور اُس کی عوامی تنظیموں کی خبریں بھی شامل ہیں۔

3 جون 1972 کے شمارے میں بھٹو کی اس خواہش پہ رائے زنی کی گئی جس کے تحت سربراہوں کی سطح کے پاک بھارت مذاکرات سے قبل ایک بحث چلائی جانی تھی۔ اس بحث میں حصہ لیتے ہوئے اس سربراہی ملاقات کے ا سٹیڈیا کی حمایت کی گئی۔

پارٹی کے ترجمان اِس اخبار نے بہت جذباتی ماحول کے باوجود کامن سینس کی اپنی بات نہ چھوڑی اور برملا کہا کہ بنگلہ دیش کو فی الفور تسلیم کیا جائے اور ہندوستان سے تعلقات نارمل کیے جائیں۔

پیپلز پارٹی نے ''ہمہ وقت غیر محفوظ'' انقلابی دانشوروں کی مدد سے یہ تاثر پھیلا دیا تھا کہ وہ گویا ایک سوشلسٹ پارٹی ہے۔ اُس کے اندر بدقسمت ''ترقی پسند'' لوگ بالخصوص اس فریب میں مبتلا تھے۔ اخبار عوامی جمہوریت کے اِس شمارے نے ''خو دفریبی کے طلسم سے نجات حاصل کیجیے'' کے عنوان سے پیپلز پارٹی کی سیاسی معاشی اور سماجی پالیسیوں کا اپریشن کر ڈالا۔

تحریروں کا ڈکشن ہی آپ کو بتادے گا کہ یہ سارے مضامین سی آر اسلم کے لکھے ہوئے ہیں۔

اگلا شمارہ اُس وقت کا ہے جب پاکستان اور انڈیا کی حکومتوں کے درمیان شملہ معاہدہ ہو چکا تھا۔ ایک روشن فکر اخبار کی حیثیت سے عوامی جمہوریت نے بڑھ چڑھ کے اس معاہدے کا خیر مقدم کیا۔ اُس نے اپنے سرورق پہ ایک چوکھٹا لگایا جس کے اندر اُس معاہدے کا متن چھاپ دیا۔ اور اس معاہدے کو ''امنِ عالم کی فتح'' قرار دے کر دو جہازی صفحات پر مشتمل ایک بھرپور مضمون شائع کیا۔

یہ وہ زمانہ بھی ہے جب حکومتِ سندھ نے سندھی زبان کو سندھ کی سرکاری زبان قرار دیا تھا۔ اور اس کے خلاف اردو بولنے والوں اور ملک بھر کے رجعتی عناصر کی طرف سے شدید ردعمل آیا تھا۔ یوں سندھی اردو کو تنازعہ بنا کر ایک بہت بڑا مسئلہ بنا دیا گیا۔ عوامی جمہوریت نے اپنے اداریے میں اسی معاملے کو ایڈریس کیا۔

''سندھی کو صوبہِ سندھ کی سرکاری زبان بنانے سے اردو کی حیثیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ جہاں تک ذریعہ تعلیم کا تعلق ہے، مادری زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دے کر سکولوں اور کالجوں میں سندھی اور اردو دونوں زبانوں کی تعلیم لازمی بنا کر اس مسئلے کو بہ آسانی حل کیا جاسکتا ہے''۔

اگلے شمارے میں بھی اسی مسئلے کو زیر بحث لایا گیا۔ واضح ہو کہ اس بیچ سندھ میں لسانی فسادات ہو چکے تھے اور خون بھی بہا تھا۔ اخبار نے اپنے بیک ٹائٹل پر ''سندھی لسانی بل'' کا عنوان لگایا۔ باشعور کر دینے والا ایک پس منظر دیا اور یہ کہہ کر اِس پورے بل کو من وعن شائع کر دیا۔ ''۔۔ہمیں یقین ہے کہ اِس بل کی مخالفت کرنے والے عوام کی 99 فیصد کو یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ اس بل میں کیا لکھا گیا ہے جسے سندھ اسمبلی نے منظور کیا ہے''۔

اس شمارے کا اداریہ ''مزدور تحریک کی خامیاں'' کے عنوان سے ہے۔ پس منظر کراچی میں مزدوروں پر فائرنگ کے نتیجے میں بہت سے مزدوروں کی ہلاکت تھی۔ حکومت کے رول کی بھرپور مذمت کے بعد اداریہ خود مزدوروں کی صفوں میں عدم اتحاد، اُن کی تنظیمی کمزوری اور ان میں شعور کی کمی کا ماتم بھی کرتا ہے۔

17 جون 1972 کے عوامی جمہوریت میں پاکستان سوشلسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی میٹنگ (منعقدہ 11 جون) کی ایک قرارداد پر پورا جہازی صفحہ وقف کیا گیا۔ یہ قرارداد بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے حق میں تھی۔ اُس زمانے میں جس معاملے پر کشت وخون والا مباحثہ چل رہا تھا، وہ آج کی نسل کو مذاق لگتا ہے۔ دراصل جب بنگال اپنی آزادی حاصل

کرچکا تو پاکستان میں اُسے تسلیم نہ کرنے کی زبردست تحریک چلائی گئی۔ ''بنگلہ دیش نامنظور'' کا ڈرامہ پورے سرکاری میڈیا ، یونیورسٹیوں اور پارلیمنٹ میں چل رہا تھا۔

ہفت روزہ عوامی جمہوریت اور اُس کی سیاسی پارٹی اس سب کچھ کو رائٹسٹ سازش قرار دے رہے تھے ۔ پارٹی بنگلہ دیش کو ایک حقیقت کے بطور تسلیم کرنے پہ کمپین چلا رہی تھی۔ دراصل یہ معاملہ اُس وقت رائٹ اور لیفٹ کے بیچ فکری جھگڑے کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ رائٹ وِنگ (جس کا نمائندہ ریاست رہی ہے) بنگلہ دیش مخالفت کی آڑ میں بھارت اور سوویت یونین کی دشمنی کا محاذ سنبھالے ہوئے تھی۔ بنگلہ دیش محض اُس ساری پالیسی کا بہانہ بن گیا تھا۔ عوامی جمہوریت صرف بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کی بات نہیں کرتا تھا بلکہ وہ اس کے ساتھ ساتھ ''پڑوسی ممالک سے دوستی'' کی وکالت بھی کرتا تھا۔

اس شمارے میں حسب معمول پولیٹیکل اکانومی کے موضوع پہ جاری نظریاتی مضامین کی اگلی قسط موجود تھی۔ اس کے علاوہ اِس میں پاکستان کے بجٹ پر ایک تنقیدی مضمون بھی موجود ہے۔ اسی طرح ایک آرٹیکل بعنوان ''اشتراکی اور سرمایہ دارانہ نظامہائے پیداوار کے نتائج کا فرق'' لکھا گیا۔

24 جون کے شمارے میں ''قومی بجٹ اور سائنٹفک سوشلزم'' کے عنوان سے نیم سوشلسٹ اور آدھے کپٹلسٹ دانشور بھٹو ئی وزیر خزانہ ڈاکٹر مبشر حسن کی معاشی پالیسیوں پر زبردست تنقید کی گئی ۔ دوسری طرف اس شمارے میں عطاء اللہ مینگل کے اس قدام کی حمایت میں پورا اداریہ چھپا گیا جس میں اس نے ساڑھے بارہ ایکٹر خوشکابہ اراضی تک کے مالکان پر لگا ہوا مالیہ اور مویشیوں کی چرائی اور مزری پر لگے ہوئے ٹیکسوں کو معاف کیا۔

8 جولائی کے شمارے کی پیشانی ''امنِ عالم کی فتح ۔۔۔شملہ معاہدہ'' کی حمایت میں لکھے مضمون سے جگمگا رہا ہے ۔ اس سمجھوتے کے فائدوں کے تذکرے کے لیے پورے دو صفحے صرف کیے گئے ۔ یہ مضمون دائیں بازو کے مضبوط پریس اور بورژوا دانشوروں کے ردعمل کی پیش بندی ہے جس کی کہ توقع کی جارہی تھی۔ ہفت روزہ عوامی جمہوریت کی طرف سے بھٹو کے جن دوچار اقدامات کی حمایت کی گئی اُن میں شملہ معاہدہ بھی شامل ہے۔

اس کے علاوہ اس شمارے میں چلی کے صدر آلندے کے اُس آئینی ترمیم کو سراہا گیا جس کے تحت اس نے امریکی ادارے انٹرنیشنل ٹیلی فون اینڈ ٹیلی گراف کمپنی کے سرمایہ کو قومی ملکیت میں لیا۔ اس مضمون کا شاندار عنوان ہے ''چلّی ترقی کی راہ پر''۔ اُسی آلندے کو بعد میں امریکی سامراج نے چلی پر حملہ کر کے مورچے میں شہید کر دیا تھا۔

''نعرے بازی کی سیاست'' کے نام سے ایک مضمون میں جماعت اسلامی کے اس نعرے ''سرخ و سفید سامراج'' اور چند نام نہاد پراگریسوز کے نعرے '' روسی سوشل سامراج'' کی یکسانیت کو بے نقاب کیا گیا۔

15 جولائی 1972 کا شمارہ مختلف شہروں میں پاکستان سوشلسٹ پارٹی کی سرگرمیوں پر مشتمل رپورٹوں کا شمارہ ہے ۔ اس میں ایک بار پھر شملہ معاہدہ کی حمایت کی گئی۔ اسی طرح سندھ میں سندھی زبان کو صوبائی زبان بنانے کے اقدام کو سراہنے کے اپنے موقف کو دہرایا گیا ہے۔

22 جولائی 1972 کے شمارے میں سی آر اسلم نے ''عالمی سیاست میں نئی کروٹ'' کے عنوان کی ایک سرخی دی ۔ یہ دراصل اُس وقت کی چند اہم پیش رفتوں کا تذکرہ ہے۔ اول تو امریکی صدر نکسن کے ایلچی ہنری کسنجر نے اولین دورہِ چین کیا تھا۔ اس کے فوراً بعد خود نکسن چین گیا تھا۔ اس دورے میں امریکی صدر نے پہلی بار اعلان کیا تھا کہ سوشلسٹ نظام اور کپٹلسٹ نظام والے ملک باہم امن سے رہ سکتے ہیں۔ یہی نکسن پھر سوویت بھی گیا اور وہاں بھی اس نے عالمی امن کی بات کی۔

دوسری پیش رفت یہ تھی کہ مغربی جرمنی کی جانب سے سوویت یونین کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کیا گیا۔

تیسری بات یہ ہوئی کہ جنوبی اور شمالی کوریا نے باہم مل بیٹھنے کا فیصلہ کیا اور باہمی مسائل گفت وشنید سے طے کرنے کا اعلان کیا۔

اخبار نے چین اور جاپان کے درمیان خیر سگالی اور خوشگوار تعلقات بحال کرنے کی سلسلہ جنبانی کا بھی خیر مقدم کیا۔

اسی طرح پاکستان اور بھارت کے بیچ شملہ معاہدہ کو بھی سی آر اسلم نے بہت اہمیت دی۔ اور وہ اُسے بھی اسی ''نئی کروٹ'' کے زمرے میں لایا۔

پیرس مذاکراتِ امن کا پھر سے آغاز بھی اہم گردانا گیا جس سے ویت نام میں قیامِ امن کی کوئی صورت پیدا ہونی تھی۔

اخبار نے مصر اور اسرائیل کے سربراہوں کی طرف سے باہمی مسائل کو گفت وشنید کے ذریعے حل کرنے کی خواہش کے اعلان کو بھی بہت اہمیت دی۔

اسی شمارے میں وہ مشہور دستاویز بھی چھاپ دی گئی ۔ جو کہ ''ویت نام کی ماؤں کی جانب سے دنیا بھر کی ماؤں کے نام کھلا خط'' کے نام سے مشہور ہے۔

امریکی اداکارہ جین فونڈا

کی اُس پریس کانفرنس کا بھی تذکرہ ہے جس میں اس نے امریکہ کی طرف سے ویت نام کے خلاف جنگ مسلط کرنے اور وہاں جنگی جرائم کا مرتکب ہونے پہ سخت احتجاج کیا تھا۔

اخبار نے 'پاکستان سوشلسٹ پارٹی کی سرگرمیاں' کے عنوان سے ایک صفحہ وقف کیا۔

شمارے کا آخری صفحہ حسب معمول پولیٹکل اکانوی کی قسط کا ہے۔

5 اگست 1972 کے شمارے کا بڑا مضمون ''سندھ میں لسانی فسادات کا سرسری جائزہ'' کے موضوع پر لکھا گیا ۔اخبار کی طرف سے شاونسٹ عناصر کی جانب سے بھڑکائے گئے ان فسادات کی مذمت کی گئی ۔اوران مجرموں کو عدالت میں پیش کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔

اداریہ بھی اسی موضوع پہ ہے : زبان کا مسئلہ اور مفاد پرست عناصر۔بس اُس خوبصورت اداریے کا اوپنگ فقرہ دیتا ہوں: پاکستان سوشلسٹ پارٹی کے نزدیک پاکستان چار قومیتوں پنجابی ، پٹھان ، بلوچ اور سندھی کا ملک ہے ۔اور ہر قومیت کی اپنی زبان ہے ۔سوشلسٹ پارٹی ان زبانوں کی ترقی و ترویج کے حق میں ہے اور وہ چاہتی ہے کہ یہ چاروں زبانیں ترقی کریں''۔

12 اگست 1972 کا شمارہ جلد نمبر 3 کا شمارہ نمبر 30 ہے ۔ ''تجدید عہد'' کے عنوان کے تحت اولین مضمون کے آخری دو چار فقرے یوں ہیں:

''۔۔۔آؤ آج عہد کریں کہ ہم جاگیرداری زرعی نظام کو ختم کریں گے اور ''جو بوئے وہی کھائے'' کی بنیاد پر ساری اراضی کسانوں میں تقسیم کریں گے۔ہم سامراجی اثرات کا قلع قمع کریں گے۔اس کا سرمایہ اور قرضے ضبط کریں گے ۔ہم بھاری اور بنیادی صنعت کو اولیت دے کر پبلک سیکٹر میں قائم کریں گے۔ ہم عوام کو خوشحال بنانے کے لیے انہیں جاگیرداری سماج اور اجارہ داری کی لوٹ سے نجات دلائیں گے''۔

اس شمارے میں 20 اگست کو کبیر والا کے مقام پر مغربی پاکستان کسان کمیٹی کی کونسل کا اجلاس منعقد ہونے کی اطلاع دی گئی۔ اس میں بنگلہ دیش کے الگ ہونے کے بعد بقیہ پاکستان میں کسانوں کی صورت حال کا تذکرہ ہے،اُن کی تنظیمی حالت بیان کی گئی ، پیپلز پارٹی کی طرف سے کسانوں میں نظریاتی اور تنظیمی خلفشار پیدا کرنے کی مذمت کی گئی۔ اس کے علاوہ کسان کمیٹی کو درپیش مستقبل کے چیلنجز کو بیان کیا گیا اور اُسے اپنی حمایت کا یقین دلایا گیا۔ اگلے شمارے میں بھٹو حکومت سے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔

راشن

لالہ رخ

باجی جی! مجھے بھی راشن دیں۔

بٹ صاحب نے یہ راشن فقیروں میں صدقہ خیرات کرنے کے لیے تھیلے بنا کر رکھا ہے۔

''باجی جی! میں آپ کے گھر کا سارا کام کرتی ہوں۔ کھانا بناتی ہوں۔ کپڑے دھوتی ہوں۔ برتن دھوتی ہوں۔ روزانہ صفائی کرتی ہوں۔ چھٹی بھی نہیں کرتی''۔

''اسی لیے تو ماہانہ پندرہ ہزار باقاعدگی سے دیتی ہوں''

مالکن نے فخریہ کہا

''مگر محنت کرنے والے کا حق زیادہ ہوتا ہے۔فقیروں کو بنا کام کے سب کچھ مل جاتا ہے۔ یہ روزوں کا مہینہ ہے۔ میرا بھی تو حق بنتا ہے۔ میرے بھی چھوٹے چھوٹے بچے ہیں جن کے لیے میں دن بھر سات گھروں میں کام کرتی ہوں''۔

''اچھا اچھا میں شیخ صاب سے پوچھ کے تمہیں بتاوں گی۔کل مجھے یاد کروا دینا''

محنت کش خاتون کے سانولے چہرے پر قدرے اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

دوسرے دن صبح صبح ہی وہ مالکن کو یاددہانی کے لئے پہنچ گئی۔

''باجی جی!

راشن کے لئے صاب سے کیا بات ہوئی؟''

مالکن کو اس کی بے صبری اچھی نہ لگی۔(بھوکی کہیں کی)

مالکن کے چہرے پر لکھا تھا۔

شیخ صاحب نے مولوی صاحب سے مسئلہ پوچھا تھا کہ کیا کرسچن کو رمضان کا راشن دے سکتے ہیں؟

پھر مولبی صاب نے کیا کہا؟

مولوی صاحب کہتے ہیں

(بھوک ننگ بھی ڈھیٹ بنا دیتی ہے)

رمضان کا راشن عیسائیوں کو نہیں دے سکتے

سانولا چہرہ سیاہ پڑ گیا ۔مایوسی کی پیلاہٹ نے اس کی آنکھوں میں امربیل بچھا دی۔ پھر جیسے اس کی اس بھڑک اٹھی

باجی جی ! رمضان کا راشن نہ دیں۔ ہمارے بھی روزے چل رہے ہیں۔ 31 مارچ کو ہمارا ایسٹر ہے۔اپ مجھے ایسٹر ہی کا راشن دے دیں۔

مالکن اس دلیل پر سوچ میں پڑ گئی۔۔۔۔۔ نہ کرنے کی صورت میں کام والی ہاتھ سے نکل سکتی تھی.

سارا کام کاج سنبھال رکھا تھا .... اگر چھوڑ گئی تو سکون غارت ہو جائے گا

مالکن نے اسے راشن کا ایک بڑا تھیلا اسکے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں تھما دیا

کسی کو بتانا نہیں.. سب میرے پیچھے پڑ جائیں گے کہ عسین کو رمضان کا راشن دے دیا''۔

''نہ جی مجھے کیا چٹی پڑی ہے کسی کو بتانے کی۔خدا آپ کو جھولیاں بھر بھر کے رزق دے''۔

وہ خوشی سے نہال ہو گئی۔

کراچی میں بلوچ و مکرانی کے قصے

رمضان بلوچ

کیچ مکران سے آئے ہمارے ایک بہت ہی باذوق۔ باادب اور پیارے دوست نے کافی عرصہ یہاں رہنے کے بعد کراچی کی ادبی فضا سے متاثر ہوکر اردو شاعری میں طبع آزمائی شروع کی۔تب انہیں ایک عدد" تخلص" کی ضرورت پڑگئی۔ دوستوں سے مشورہ کیا۔ بہت سے آہ وبکاہ سے بھرپور پر درد اور کہیں کہیں پرشور قسم کے تخلص تجویز ہوئے جوانہیں پسند نہیں آئے۔ بعد میں یہ" بھاری بوجھ" انہوں نے بذات خود اپنے کندھے پر لے کر معاملہ کو حل تک پہنچایا۔ بہرحال ان کا اپنا رکھا ہوا منفرد اور یکتا تخلص تو ان کا کچھ بگاڑ نہ سکا لیکن جگہ جگہ نام کے ساتھ مکران سے وابستگی کی گرہ لگانی جو شروع کی تو یہ "قوم پرستی" کا جذبہ ان کے لئے عذابِ جاں بن گیا۔

ہوا یہ کہ ان ہی دنوں میں ایک مرتبہ انہیں اپنے رشتہ داروں سے ملنے میرپورخاص جانا پڑا۔ اتفاق سے ٹرین میں ان کے ہمسفر ٹکسالی اردو زبان کے ایک منجھے ہوئے شاعر تھے۔ پورا سفر شعروشاعری اور ادب وآداب ہی میں گزر جاتا اگر بزرگ شاعر کی نظر سیٹ پر رکھے ہمارے دوست کے سفری بیگ پر نہ پڑتی جس پر مارکنگ پین سے لکھا تھا "فلاں فلاں مکرانی!" "فلاں فلاں' تو ان کی سمجھ میں فوراً آ گیا لیکن ' مکرانی' پر وہ اٹک گئے۔ بولے "میاں! آپ لگتے تو بلوچ ہیں یہ مکرانی کی دم کیوں لگا رکھی ہے!" پورے سفر میں ہمارے دوست ان محترم کو وضاحت دیتے رہے کہ مکرانی اور بلوچ کی کوئی الگ الگ شناخت نہیں بلکہ وہ ایک ہی قوم کے فرد ہیں۔

دلچسپی کی بات یہ ہے کہ کراچی میں مکرانی کی اس اصطلاح نے یہاں کے سنیما گھروں میں "جنم" لیا تھا۔ ہوا یوں کہ سنیماؤں کو کسی زمانے میں شہر کی بہت ہی سستی تفریح فراہم کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے تینوں شوز میں تماشبینوں کا بڑا رش رہتا تھا۔ اس رش کو قابو پانے کے لئے سنیما مالکوں نے نظم و ضبط قائم کرنے اور ٹکٹ خریدنے ،قطاروں کی لائنیں سیدھا کرنے کے واسطے لیاری کے علاقہ سے کچھ سیاہ فام اور کچھ سانولے " مکرانی جمعداروں" کی خدمات حاصل کی ہوئی تھیں جن کے ہاتھوں میں اس دور کا سب سے بڑا "ہتھیار" یعنی ایک چھڑی ہوتی تھی جس کا استعمال وہ بے دریغ کرتے تھے۔ چھڑی کے "متاثرین" میں زیادہ تر قیام پاکستان کے بعد ہندوستان کے شمالی علاقوں سے آئے مہاجر لڑکے شامل ہوتے تھے۔ جمعداروں سے وہ اس حد تک خوفزدہ رہتے تھے کہ دور سے دیکھتے تو ایک دوسرے سے کہتے "ابے بھاگ! مکرانی آرہا ہے۔"

کراچی دراصل شروع سے مختلف مذہبی رواداری اور متنوع ثقافتی اقدار پر مبنی ایک پرامن کاسموپولیٹن شہر رہا ہے۔ اکثریت بہرکیف یہاں سندھی ہندو برادری کی تھی۔ تعلیمی۔تجارتی۔سیاسی اور سماجی لحاظ سے انہیں برتری حاصل تھی۔ تقسیم ہند کے بعد 7 جنوری 1948 کو رتن تلاؤ گردوارے کے اندر بدقسمتی اور انتظامیہ کی غفلت سے پیش آنیوالے سینکڑوں سکھ خاندانوں کے افراد کی ہلاکت کے بعد یہاں سراسیمگی پھیل گئی اور نتیجتاً پوری ہندو برادری ہندوستان منتقل ہوگئی۔ اس تعلیمی۔تجارتی۔ سیاسی اور سماجی خلا کو ہندوستان سے آئے مسلمان مہاجر برادری نے پر کیا۔ ثقافتی میدان میں بھی یہی طبقہ حاوی رہا جس سے یہاں اردو زبان اور ادب کی خوب نشوونما ہوئی۔ بعد کے دنوں میں یہیں سے دانشور حلقے بھی سرگرم ہوئے جن میں زیادہ تر چھڑی سے متاثر شدہ ماضی کے وہ "سنیما والے لڑکے" بھی شامل تھے جو آخر تک رعب دار سرخ وسفید واجبہ ٹائپ افراد کو "بلوچ" جبکہ جنگجو لڑنے بھڑنے اور سر سے ٹکر مارنے والوں کو کم تر نسل کے لوگ قرار دے کر " مکرانی" سمجھتے اور کہتے رہے۔

بہرحال یہ سب پرانے وقتوں کی باتیں تھیں۔ اب تو پل کے نیچے سے کافی پانی بہہ چکا ہے۔ مہاجر برادری کی آج تیسری نوجوان نسل بلوچوں کے ساتھ زیادہ گھل مل کر ہمارے قومی معاملہ کی طے تک پہنچ چکی ہے۔ یہ بات اچھی طرح ان کے ذہنوں میں بیٹھ گئی ہے کہ بلوچ ثقافت سے وابستہ اور بلوچی زبان بولنے والے تمام لوگ بلوچ ہی کے زمرے میں آتے ہیں۔ ان میں نسلی لحاظ سے بھی کوئی اعلیٰ یا ادنیٰ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کراچی میں اب " مکرانی" کا لفظ منفی معنوں میں استعمال ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ اب یہ معاملہ قصہ پارینہ ہوچکا ہے اگرچہ کبھی کبھی کہیں کہیں سے کچھ ہلکی سی آوازِ باگشت سنائی ضرور دیتی ہے۔

علم وادب سے وابستہ ڈاکٹر احمد سہیل صاحب ہماری طرح لاابالی قسم کے کوئی گمنام، علم سے بے بہرہ عام آدمی ہیں اور نہ آگے بڑھتی دنیا کی تیز رفتاری سے بے خبر کسی پرانے اور شکستہ کنویں میں مینڈکوں کی طرح کے ہم جیسے باسی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ماشاالله اردو زبان کے معروف شاعر۔ ادبی و ثقافتی نقاد۔ مقالہ نگار۔ مترجم اور ماہر عمرانیات ہیں اور غالباً آجکل ان کی مستقل رہائش امریکہ کی کسی خوشحال ریاست میں ہے۔

ہمارے لئے فخر کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر پیرزادہ قاسم۔ پروین شاکر۔ عبدالقدیر خان۔ نصرت جاوید (معروف سینئر صحافی)۔ سابق کمشنر کراچی جی۔ اے۔ مدنی و دیگر معزز شخصیات کی طرح احمد سہیل صاحب بھی کراچی کی قدیم ترین عوامی بستی لیاری میں ابتدائی زندگی گزار چکے ہیں۔ ابھی

تک یہاں کے دو دوست رشید اور شریف ان کی یادوں میں شامل ہیں۔

ہم سے ان کا "غائبانہ تعارف" چند دن پہلے اس وقت ہوا جب فیس بک پر ان کی ایک پوسٹ یا مقالہ بعنوان "شیدی اور مکرانی کون ہیں۔۔۔ان کی تاریخ۔ معاشرت اور ثقافت کا مختصر احوال" ہماری نظر سے گزرا اور وہیں ہم ٹھٹھک کر رہ گئے تھے کہ "مکمل مکرانی" تو ہم بھی ہیں لیکن ہماری تاریخ۔ معاشرت۔ اور ثقافت کا جو نقشہ انہوں نے کھینچا ہے اس میں نہ ہم نظر آتے ہیں اور نہ ہماری تاریخ۔ معاشرت اور ثقافت کا کوئی رنگ اس میں شامل ہے۔

اس تجسس میں ہمیں ان کا یہ مقالہ دو تین مرتبہ پڑھنا پڑا تب کہیں جا کر ہم پر منکشف ہوا کہ مقالہ نگار کی تحریر جو بظاہر "خیالی صورت گری" لگتی ہے وہ حقیقت میں کافی عرصہ "وطن سے دوری" کی وجہ سے ظہور پذیر ہوئی ہے مگر ساتھ ساتھ ہمیں اس تحریر میں بلاشبہ اپنائیت اور نیک نیتی کا جذبہ بھی کارفرما محسوس ہوا۔

ہم اسی نتیجے پر پہنچے کہ صاحبِ قدر تک شاید یہ "خبر" نہیں پہنچی تھی کہ ان کے مقالہ کے اہم اور بنیادی کردار " مکرانی" تو کب کے صدیوں پہلے بلوچ ثقافت کا حصہ بن چکے ہیں۔ اب جو مکرانی ان کے ذہن میں ہیں ان کی کوئی الگ لسانی یا ثقافتی شناخت ہے اور نہ ان کی پہچان۔ زبان۔ ادب اور طرز زندگی مختلف ہے جیسا کہ احمد سہیل صاحب رقمطراز ہیں۔

جن موضوعات کو مقالہ میں جگہ دی گئی ہے ان پر تاریخ کے طالبعلموں کی رہنمائی کے لئے کئی بلوچ اسکالرز اور رائٹرز نے تاریخی حوالوں کے ساتھ تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے ان میں ڈاکٹر پروفیسر حفیظ جمالی اور ڈاکٹر حمید بلوچ شامل ہیں جنہوں نے انگریزی اور اردو زبانوں میں اس موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی ہیں۔

ان کے علاوہ معروف مصنف۔ دانشور اور ہاورڈ یونیورسٹی کے ڈاکٹر فیروز احمد نے Africa on the coast of pakistan کے عنوان سے لکھے گئے اس مقالہ میں افریقہ کے غلام کئے جانے والے سیاہ فام مظلوم انسانوں کی خرید و فروخت۔ اس خطے میں ان کی برآمدگی اور انیسویں صدی میں غلامی کے خاتمہ کے بعد ان کی موجودہ طرز زندگی تک کے سفر کا احاطہ کیا گیا ہے۔

ہم یہاں بی بی سی ڈاٹ کام میں 14 جولائی 2020 کو شائع ہونے والی سحر بلوچ کی ایک رپورٹ بعنوان "پاکستان کے سیاہ فام شہری: شیدی برادری کی تاریخی داستان" کا حوالہ دینگے جس کے آغاز ہی میں مظلوم انسانوں کی ایک تصویر کے ذریعے بتایا گیا ہے کہ 1875' میں کینیا کے شہر مومباسا کے نزدیک غلاموں سے بھری کشتیوں سے بازیاب کروائے گئے یہ غلام جنہیں خلیج فارس۔ گلف اور مکران کوسٹ بھیجا جا رہا تھا۔'

سحر بلوچ آگے بتاتی ہیں کہ "(غلامی سے آزاد ہونے کے بعد) افریقی نژاد افراد خطے میں جہاں جہاں آباد ہوئے ہیں انہوں نے وہیں کی تہذیب میں خود کو ضم کرلیا ہے۔ کئی جگہوں پر ان کے لئے وہاں کی روایات اپنانا آسان بنا اور وہ ان کی شناخت کا حصہ بن گئے۔ جبکہ دوسری جگہوں پر ان کی اپنی منفرد شناخت قائم رہی۔ سندھ اور گجرات میں ان روایات کو اپنانے کا تدارک ایک طرح سے ایسا ہوا کہ شیدی کہلائے جانے والے افراد ایک الگ طبقے میں شامل ہوئے اور اپنی شناخت بنا پائے۔"

محقق و پروفیسر ڈاکٹر حفیظ جمالی اپنی کتاب Shore lines of Memory and Ports of Desire میں بات کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "سندھ کے برعکس بلوچستان میں بجائے اپنی الگ شناخت بنانے کے شیدی برادری سے تعلق رکھنے لوگ پہلے سے موجود (بلوچ) قبائل کا حصہ بن گئے۔"

تو جناب! انگریزوں کے دور میں یا اس سے پہلے بلوچستان سے جس بلوچ آبادی نے کراچی (لیاری) میں نقل مکانی کی ان میں یہ سیاہ فام بلوچ برادری کے لوگ بھی شامل تھے۔ البتہ اس برادری میں سے کچھ گروپس موسیقی (مگرماں ڈرم)۔ لیوا رقص اور بغدادی سیفی لین میں مومباسا اسٹریٹ کے ذریعے اپنے آباواجداد کے (افریقی) Roots کی یاد کو تازہ کرتے ہیں لیکن بنیادی طور یہ سب بلوچ قوم اور کلچر کا حصہ ہیں۔ یہی تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے علم و ادب۔ اسپورٹس (فٹبال۔ باکسنگ۔ سائکلنگ) اور سماجی خدمات کے حوالے سے بلوچ قوم کا سر بلند کیا ہے۔

تعصب۔ نسلی و مذہبی امتیاز اور کسی بھی قسم کے تحفظات کے بغیر مختلف طبقات کے درمیان پیار و محبت۔ یکجہتی اور انسان دوستی پر مبنی اولڈ کراچی کے روایتی اور خوبصورت رنگ اب بھی لیاری میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔

سینیئر صحافی حنا ماہ گل رند نے 6 مئی 2007 کو The News on Sunday کے کولاچی پیج میں اپنے آرٹیکل میں "شیدی دھمال" کی تفصیلات بتائی ہیں جس میں یہ بات واضع کی ہے کہ "لیاری کو ایک 'منی (چھوٹا) برصغیر' کہا جائے تو یہ غلط نہیں ہوگا کیونکہ برصغیر کی تمام قومیتیں یہاں آباد ہیں اور کچھ تو تقسیم سے پہلے کی ہیں۔ ان میں پنجابی۔ سندھی۔ کشمیری۔ ہزارہ۔ پختون۔ بلوچ۔ شیدی (پاکستان میں افروایشین کے لئے مقامی اصطلاح)۔ سرائیکی۔ میمن۔ کچھی۔ بنگالی۔ کاٹھیاواری۔ بوہری اور اسمٰعیلی یہاں آباد ہیں۔" ان میں کرسچن۔ ہندو۔ بہاری اور شمالی ہندوستان سے آئے مہاجر اور میانوالی قومیت کے لوگ بھی شامل ہیں۔ فوقیت یہاں انسانی اقدار کی ہے۔

یہ سب ایک گلدستہ میں مختلف رنگوں کے خوبصورت پھولوں کی مانند ہیں جن کی مہک سے فضا ہمیشہ معطر اور گلشن ہمیشہ پھلتا پھولتا آباد ہی رہتا ہے۔ یہی زندگی کے رنگ ہیں اور یہی زندگی کی خوبصورتی بھی ہے۔

عورت اور آزادی

تحریر: شئے مرید

آزادی اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک عورت کو ہر قسم کے جبر سے آزاد نہ کیا جائے۔

ہم بحیثیت قوم، قومی زندگی کے بعض شعبوں میں پسماندہ مانے جاتے ہیں لیکن چند ایک شعبہ زندگی ایسے ہیں جس میں گویا ہم ترقی یافتہ قوموں کی برابری کا دعویٰ تو نہیں کرسکتے.

بقول ڈاکٹر جلال بلوچ:

''وہ ہستی جو انسانی معاشی نظام کی بانی ہے، وہ ہستی جو سماجی زندگی کی بانی ہے، وہ ہستی جس کے سماجی نظریے نے انسان کو مدنیت سے آشنا کیا وہ ہستی جس پہ انسان کی بنیادی تربیت معلّمہ کی زمہ داری ہے، وہ ہستی جو دیوی تصور کی جاتی تھی جسے ثابت کرنے کے لیے آج تک دریافت شدہ آثار ہی کافی ہیں

مختلف تہذیبوں کے آثار دیکھ کر بھی اس بات کو تقویت ملتی ہے کہ عورتیں (دیویاں) دیوتاؤں سے زیادہ طاقتور پر عقیدت تصویر کی جاتی تھیں۔

عظیم مرتبے کی مالکن ہوتے ہوئے تمدنی زندگی کے بعد بھی مردانہ سماج نے آج تک عورت کو کس مقام پہ رکھا ہے۔

ضلع حب و لسبیلہ مردانہ سماجی کے طور پر پسماندہ نہیں ہے مگر کیا وندر میں کوئی فیمیل ڈاکٹر، انجینئر، سیاست دان، پروفیسر موجود ہے؟

کیا آپ کے آس پاس کوئی بلوچ یا لاسی قوم کی بیٹی کسی ادارے سے وابستہ ہے؟

یا ہم میں سے کسی کی بہن یا بیٹی اس مردانہ نظام میں حکمرانی کررہی ہیں؟

بقول نیلسن منڈیلا ''تعلیم سے ہی کاشتکار کی بیٹی ڈاکٹر بن سکتی ہے''

مگر کیا مذکورہ ضلع کی مزدور یا امیر کی بیٹی ناسا میں سائنسدان نہیں بن سکتی؟

ہمارے ہاں نوجوان اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوکر بھی اپنی بیٹی اور بہن کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ نہیں کرپارہے ہے کیا یہ مردانہ سماجی کی تصور ہے؟

لیلیٰ احمد کہتی ہے کہ وہ عورتوں اور مردوں کے جداگانہ دائرہ کار کس تصور فطرت کے کسی قانون پر مبنی نہیں بلکہ یہ معاشرتی رسم ورواج اور عادت کا نتیجہ ہے''۔

جب سماج میں عورتوں کی حکمرانی کو قبول کیا جائے اور عورت کو مرد کے برابری کا مساوات دی جائے۔

اگر سماجی رواج کی زنجیروں کو توڑنے کی کوشش نہیں کی گئی اور عورت کو کم عقل، چار دیواری اور مرد کی عزت تصور کی جائے تو پھر نامکمل ہوگی تو پھر آپ ایک عظیم لیڈر پیدا نہیں کرسکتے۔

خواتین نے ہر دور میں سماجی یا قومی تعمیر و ترقی اور آزادی اور خودمختاری کی جدوجہد میں نمایاں کردار سرانجام دی ہیں۔۔

ہمارے ہاں اکثر یہ تاثر دیکھنے کو ملتا ہے کہ بیٹی باہر نہیں جاسکتی اور نہ اکیلی لڑکی سفر کرسکتی ہے اگر کوئی والد یا بھائی اپنی بہن یا بیٹی کو اعلیٰ تعلیم کے لیے کوشاں ہے تب بھی مردانہ نظام باپ کو ذہنی طور مارنے کی کوشش کی کرنی ہے۔ اگر مذکورہ ضلع میں حقیقت پر مبنی تحقیق کی جائے تو آج بھی کوئی نہ کوئی ایک بلوچ یا لاسی باپ اپنی بیٹی کے لئے جدوجہد کررہا ہے جو کہ بلوچ سماج کی روشن خیالی کا آئینہ دار ہے۔ مجھے وہ والد یاد ہے جو ہر جگہ اپنی بیٹی کی جدوجہد کی بات کرتا ہے اور اپنی بیٹی کو قابل احترام ہستی سمجھتا ہے۔

آج بھی ضلع حب و لسبیلہ میں بیٹیوں کو مورتیاں بنا کر گھر کی زینت بنائی جاتی ہیں جو گھر کی چار دیواری اور خاندان تک محدود ہوکر رہ گئی ہیں۔

ضلع حب و لسبیلہ میں بیٹیوں کو شعوری آزادی تک نہیں ہے آپ کی بیٹی علمی ادبی کتاب پڑھ نہیں سکتی اپنی خواہشات کو قربان کررہی ہے اس سماج کے لئے جہاں عورت کو ذہنی آزادی نہیں دی جاتی ہے جہاں مذہب کے نام پر عورت کو سیاسی، معاشی اور سماجی عمل سے دور رکھا آپ کے گھر کی عورت اپنی مرضی سے ووٹ ڈال نہیں سکتی، یہ آپ کی بیٹی کو شخصی آزادی بھی نہیں ہے۔

اگر عورت کو سماج میں ذمہ داریاں دی جائیں تو اس کی صلاحیتوں سے معاشرہ زیادہ مستفید ہوگا۔

ہندوستانی رہنما سبھاش چندر بوس کا کہنا تھا کہ وہ تم مجھے بہادر ماں دو میں تمہیں ایک بہادر قوم دونگا''

آج بھی ان علاقوں کے ہر گاؤں میں عورت کو کبھی بھی کھلے دل سے اپنا کردار ادا کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔

یہ تحریر اس گمنام بیٹی کے لئے ہے، جو اس سماج میں جی رہی ہے۔ وہ ایک فرازی شخصیت ہے جس کی قدرتی خصوصیات اور قابلیتیں اسے اپنے اندر بہتر بناتی ہیں۔ اس کی توجہ، حسنِ تبسم، اور سماج میں اثرات کی خاصیتوں کی بدولت وہ دوسروں کو بھی انسپائر کرتی ہے۔ اس بیٹی کو اس تحریر کے ذریعے سلام پیش کیا جاتا ہے، جو اپنے اظہار کے ذریعے ان تمام بیٹیوں کو روشنی کی راہ دکھاتی ہے جو خود کو خواتین کے میدان میں کامیابی اور عزت کے مواقع پیدا کرنا چاہتی ہیں۔

ولادیمیر ایلیچ لینن

ولادی میر مایاکوفسکی

مناسمائیں کہ تئی بدواہ
وتی شافاستریں لٹاں
دستاں سک کنت کوشتنت
تئی شاعر
گڑہ تئی سنگتیں شاعر
ہپلنت زہرا، کڑوبی انت
''شاعری اشیں؟
انا،
پروپیگنڈہ ایں پہکا۔
ئیں احساس وئیں جذبہ
چھڑولفاظی انت ہشکیں!''
ہچ شک نے کہ ''کیپٹل ازم''
ٹلینگی ثاں
نہ اکھر جوانیاچی نہ؛
''بلبل''
ءِ آواززیات وشیں۔

گڑہ دہِ مس گوئراِش تراں رواں
ہروختے کہ جواز ہیئی۔
بل کہ ٹپّا
مڑوخیں نعرہ ای
دوبارّروا
گوشاں کفاں!
مناں سرحال ءِ
ہچبر کمی نویشہ
تہ سئی ءِ،
بلے نیں
وخت نیں

عشق ءِ ءِ کج آڑتغیں بکواسءِ۔
منی دراہیں
گرندوخیں شاعری ءِ
طاغت
تئی ایں
اَے منی طبقہ
کہ بربرحقیں جنگے آ
مڑغایءِ!

''پرولتاری''
کہ لگّی نبھڑیں لوزے
پہ گزرکنغا
پہ ہماہاں
کہ کمیونزم
سٹی ثش
ہڑمب ءِ ہواڑءِ تہا۔

حالانکہ ، پرما،
تہ اَے لوز
سازءِ، زیمرءِ وشیں
کہ کنتاں مُڑدغاں باغہ
کہ کڑوبی ایں
کن انت جنگا۔

***

محل وماڑی لڑزاناں
پہ وش نزبخہ بی انتاں
بڑزی منزلاں اوذا

روائنت پچ انت
پرات
آنہانی تہہ خانہ آنی،
لڑزاناں:
''ماوتی سنگلاں
پروشاناں
آجوکنوں وترءَ
آزمائے
پراخیں نیلغ ءَ لافا
ڈتا
ثرہ
ڈونگھائیں سنگ ءِ کوریں تنک ایں
غلام گردشاں۔
آں کیث ـــــ۔
مزدورءِ پسک
کہ تنگا لیڈرنہ ویشہ
کہ مچہ کنت پرولتاریہءَ
وتی چیارمس کنڈاں'
بچار
اَے دنیااولاکسانیں
پہ سرمایہ ءِ حرصالا لچا؛
کہ گوں وتی بلین ڈالریں
ڈائمنڈ پوشغیں دستاں،
بربادکئی
حاصل کنغ ءِ وہاواں گنداناں
داں جہنم ءَ۔
سرمایہ
روث قبضہ کناناں دوہمی مُلکاں۔
رونت دیماوڈّھاناں

آسناں مڑائیناناں
تُئی پہ جن ءُورا۔

''گش!''
آں واھوءَ دارنت؛
بلاّں زرءِ دوگونڑیں
ضرورمئے پنجواں بیاینت۔

سیاہیانی قبر
گرپغوڑی کنت ہرمیتگ ءَ،
ہرشہرے
ٹھیث یک ورکشاپے
کہ ٹاہیں نغمئیں بیساکھیاں۔

ئیں کہ اَے
ہلاس ءَ بی
پتارائنت وتی قصّواں۔
گرّائی ءَ۔
سوب ءِ
کیک ءَ گڈنت وبہرہ کنت پئوثاں
بلے ـــ۔
اَش کس پُورغئے حاخانی ڈھیرءِ
دروہ دیوخیں توارا،
ہڈانی دھریں ءِ چست کنوخیں سازا
کہ
گون انش بگی ءُکیندری ءَ ۔

''تہ ماراغدہ گندءِ
جنگ ءَ آسی پڑا۔

وخت معاف ءَ نہ خنت
ہونی ایں جرما۔
آں پیذاغیں۔۔۔
پوہ وسرپذیں لیڈر۔۔۔
گوں توجنگ ءَ
اعلان ءَ کنغا پہ
تا کہ جنگ ختم بہ بی، پہ ہمیش''

انڑسانی
کمب
درءَ کاینت
پہ دراہیں جہان ءَ
پہ سیلاب آرغا

بازڈونگھائی
ہون ءِ اوتُغ ودھاناں رونت
بازبزیں ہون۔
بُڑزبیاناں رونت
داں وختیکہ
تنیائیں روشاوہاوگندوخ
شروع کثغنت پولغ ءَ
امکانانی
قیاساں پُریں پوٹو پیاہانی۔
پر۔۔۔
بشردوستاں۔۔۔
وثی سغرءَ کوپری
ڈار داثغنت
اصلیں حقیقت ءَ ڈٹیں رھنغ ءَ
جناناں۔
شوں بیثہ بنت
فٹ پاتھ
دانائی ءَ بے ترتیفیں انڈی آں گوں

روشن
کارءَ داثہ کنت شاہراہانی
پہ سجہ ایں ملین ایں
ڈکھیاپاں؟

ئیں کپٹلزم
کہ وث ایں
غلطی کنوخیں دھاڑیل،
اشی ءَ زرم کثہ نہ خنت
ئیں کثہ کنت ای لاوَ،
ہے خاطرا
آنہی مشین ءِ رستری رفتار۔
روث ودہاناں۔

آنہی نظام
زیرےجی
چوکہ زَڑدیں ہشکیں
تاخے
ہڑتال وبحرانانی۔
جھلغاں بڑزغاں
بال ءَ گیڑت

بچے کنے جابی
گوں اے سجہ ایں
تنگوچڑتغیں سرکس ءَ،
کئے ءَ ڈوھ دیغ بہ بی
او
کئی پلوبندائی
کنغ بہ بی؟
لکھ سروالائیں
او
لکھ دست والائیں

کلاس مزدورانی
زورءَ داث مغزاں وثی آں
پہ سرپدبیغا۔

***

کپٹل ءَ روش
کُترے جنغ انت او گرّ اینغ اشت
وخت ءَ گزغ ءَ پچی پچی ءَ
چوکہ بی آسن گوں قوس آں،
الیکٹرک ایغاں
داں وختیکہ وختا
زاثو پیدا کثہ
مڑدے کارل نامیں۔۔۔
لینن ءِ مزائیں براث مارکس۔
مارکس!
آنہی پورٹریٹ ءِ بُھوارنگیں فریمیں سختی
مڑدم ءَ قابو کنت۔

پرچکھر مزائیں پندھے
نیاما تاثرانی
او
آنہی زیندھ ءِ!

ہر چیزے کہ ما گندوں
مرمرءَ بندکثی ءَ
یا جیسم ءَ لافا
بے محابائیں پیرمردے معلوم بیث
کہ دیری ایں احتیاط و اختلافا ڑہ
گوئستہ۔
بلے

وختیکہ زڑتہ
مزدوراں............
اولی ایں گوئنڈیں گام
کہ داڑتی بےیقین اشت
بلے گوں جوشا............
پہ وثی انقلابہ راہا،
کہ آنہی اندرا بلغئے
بازمزائیں
تنورے

مارکس ءَ
جشہ
وثی دل دماغ
مڑدما گوئشتیں
کہ ہرفیکٹری اےءَ
وث کارکثی سجہ ایں شفٹاں
او
نال بنداناں وثی دستاں
ہر ازبابا ہر کارا
سنبھالاناں
مارکس ءَ گپتہ
موقع چکا
دُزگل
سرپلس ویلیوءِ
گوں مالاں مُڈی آں۔
وختیکہ
دوہی بغاپثغنت
چم بثغ انت اِش
بازجھل
مس ہڑمبا
کہ اکھر بڑزا
ہم بہ گندنت

اوذ کہ نافغ بہ بی
منافع خورے یئے،
مارکس ءَ
سنبھالتہ سرکڑ دوی پرولتاریہ ءِ
مس طبقاتی جنگا
پہ تنگویں روڑہ سرہ گڈ غا
کہ مزن بیثو
بیثغث
ڈھگوے
مزائین و
مڑا کائیں۔

کمیونزم ءِ زِرءَ لافا
کہ تنگا
دھندو مڑاں گاراث
گوں
کورکنوخیں معمہ آنی،
مئے خیال اث
کہ چھڑو
چانس ءِ لہرو موج
مارکشتہ کن انت
ژہ مئے دوژ ھاءَ۔

مارکس ءَ
ڈسثہ
ژہ کلاں ڈونگھائیں قانون
تاریخ ءَ،
ایرکثئی
پرولتاریہ
قیادت ءَ چکا۔

انہ،

مارکس ءَ کتاب
نہ اَنت
چھڑو پرنٹ و کاغذ،
نہ انت دنزوئیں مسودہ
گوں ہشکیں اعدادو شماراں۔

آ نہی کتاباں
آ ڑتہ نظم
مزدورانی
لوڑ گوڑیں صفانی لافا
او گوں ایمان او طاقتا پڑیں
سربری آ نہانی
کثئی دیما

سربری کثئی آ نہانی
او
گوکثئی آ نہاں
''پہ ہنت جنگانی پڑا
پہ وثی ہوناں نی پُڑ بیغ ءَ!''

نظریہ آنی ثبوت
ٹھوس ایں عمل اَنت۔

آں کیث
روشے ءَ
آں عمل ءِ جی نئیس،
او کنت سرکڑ دوی ءَ شوئے
کتاباں بہ گر
تاں جنگانی پڑاں!''۔
وختیکہ
آں لکھغایث
آخری ٹوکاں وثی

موڑ دانغ لڑزغئے ثنتی
وختیکہ
آخری خیال
ٹمکغئے ثنتی چمانی تہا،
مناں سمائیں
مارکس ءَ دیر گندی اے استث
کریملن ءِ
او بیرک ءِ
کمیون ءِ
مس ماسکوئے آزماناں۔

کیٹغ آنی ڈولا
سال شنغنث پکو بیاناں۔
مزدور
ژہ چکی ءَ مزن بیثغنث
نیٹ۔
کپٹل ءِ
برج
بے نصیب بیثغاں ژہ حفاظت ءَ
وختیکہ پرولتاری موجا
گپتہ رپتار و طاقت۔
بازیں
سالانی
علمہ سرگواث
موری مس دھنداں و مڑاں۔
کڑو بنت بغاوتاں
وختیکہ
زہرو قہر چومبیاں پُچی،
نتیجہ ءَ
انقلاب کاینت

گوئنڈ نت او بازنا ترس انت

بورژوازی ءِ رستریں بھیر؛
چیتاڑ تغنث
تھیئرز (8) وگالیفٹ ءِ
غیر انسانی ایں ہتھاڑی ءَ
ژہ پیرس ءَ،
ژہ دیوالا پیرے لال چیڑ ءِ (9)
ساء
کمیونارڈانی
تنگا واھوءَ دارنت:
''گند انت، اش کن انت
سنگتاں!
بہ سکھ اِنت
ژہ مئے پروش ءَ!''

ایو کی مڑو خانی سراموتکاں کنیں
مئے سبق ءَ
مَیلنت پہ ضائع بیغ ءَ
چھڑو
گوں یک پارٹی اے آ
دژمن دھسینتہ کیث،
منڈاواناں
سجہ ایں مزدر کلاسا
یک مزائیں مٹّے اندرا!''
''مالیڈروں!''
کسّے گشیث
گڑہ دیم ءَ پذ ءَ چڑینی ٹوڈنگاں
جنت۔

ہیل گِرنت گندغ ءَ
شیر الوزانی ءَ
ٹِک ٹِک ایں پوست ءِ!

تڈا

شاہ میر

جی باثاں تئ
جوڑاں،
کونجیں گڑ دنا تئ آ
محلیں ڈوبرئے پلاں.

کہ مئیں
ہشک وتنسو و
زذغ وآزگ و
مختاڑیں
دل ئے میٹر،
بزاں مئیں
تنی ایں جوڑانی
مہمانی ئے
تڈایاں

تڈا: مسافر کہ ہیمہ اے ءسر بی تو ہماں گس ء والا آئی دیما تغڑد بزاں چٹائی کارنت کہ اودا بہ نندی۔ مہمانی ئے ہیے تغڑ دء تڈا گشنت.

جوڑ: لنٹ

میٹر: انگلش۔۔ پیمائش ئے یونٹ

●●●●●●●●●●●●●

فصل کاٹتی تنہا لڑکی

ورڈز ورتھ / اردو: گلناز کوثر

دھیان سے دیکھو
ہائی لینڈ کے کھیت میں کھلتے اس منظر کو
ایک اکیلی لڑکی کیسے
اپنی دُھن میں
درد بھرا اک نغمہ گاتی،
فصل کاٹتی، گانٹھ بناتی جاتی ہے
تم چاہو تو خاموشی سے
اپنے رستے چلتے جاؤ
یا پھر تھوڑی دیر سنو
اس گیت کو جس کے
سندر بولوں سے وادی کی
گہری گاگر چھلک رہی ہے
مجھے شبہ ہے
عرب کے صحراؤں کی تپتی ریت پہ چلتے
تھکن سے چُور مسافر کو بھی
نخلستان سے کوئی بلبل
اس سے مدھر صدا بھیجے گا۔۔۔۔۔
یا کوئی کوئل
ہیبرا ڈیز کے پھیلے جزیروں
کی نمناک، خموش فضا میں آتی بہار کی
چاپ سے اپنی
دھڑکن باندھ کے
ایک سریلے گیت کے رس سے
گردوپیش میں یوں ہیجان اٹھاتی ہوگی
کون بتا سکتا ہے مجھ کو
گیت کے اندر ماضی کے اسرار چھپے ہیں
داستان اک رزم گاہ کی
یا کوئی بڑے الم کا قصہ
یا پھر سادہ جیون کے
اک عام سے دن کا عام سا غم جو
لمحہء موجود کو چھو کر گزر رہا ہے
اور کل پھر سے گزرے گا
بات کوئی بھی ہو سکتی ہے
پر وہ درانتی تھامے
فصل پہ جھکی ہوئی
یوں گاتی چلی جاتی ہے جیسے
سندرتا کے ساگر کا کوئی انت نہیں ہے
اور میں گھاٹی کی چوٹی پر
ساکت۔۔۔جامد
گیت کے اس جادو میں کھویا
کھڑا ہوا ہوں
گیت کے بولوں سے دل کا
وہ کونہ بھرتا
جہاں اسے میں تب بھی سنوں گا
جب یہ نغمہ تھم جائے گا

●●●●●●●●●●●●●

شوقین فیمنسٹ

امر پیرزادو

جب تم
عورت کی
محنت کی تحسین کرو
لیکن اس کی
ذہانت سے کتراؤ

جب تم عورت کو
دل سے
مرد کو
دماغ سے ملاؤ

جب خراب عورت
اور خراب مرد میں
عورت تمہارے لئے
زیادہ خراب ہو

جب تم اپنی ہی
بنائی ہوئی
لبرل سوچ سے
مات کھا جاؤ

جب تمہاری
ہمدردی بھی
عورت کی آزادی کی
نفی کرے

جب تمھارے الفاظ بڑے
اعمال چھوٹے ہوں

جب روشن خیالی
تمہارے گھر سے دور ہو

اُس وقت
اے شوقین فیمنسٹ تم
شاونسٹ مرد بن جاتے ہو
شاونسٹ مرد بن جاتے ہو•••!!

سنگت ادبی دیوان (ساد) لیاری

رپورٹ عیسیٰ بلوچ

سنگت ادبی دیوان لیاری کراچی کی ماہانہ نشست کا انعقاد بدھ 28 فروری 2024 کوشام 5 بجے بلوچ اتحاد آفس چاکیواڑہ میں مصنف رفیق بلوچ کی صدارت میں ہوا۔ دیوان کے سیکریٹری جنرل عیسیٰ بلوچ نے تمام ممبرز کو خوش آمدید کہا اور پھر ایجنڈ کے مطابق باقائدہ نشست کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے رمضان بلوچ نے "لیاری میں عہدِ فیض" کے بارے میں ایک جائزہ پیش کیا اور عبداللہ ہارون کالج لیاری میں فیض صاحب کی 8 سالہ بحثیت پرنسپل اور معروف نظریاتی مفکر ڈاکٹر م۔ ر۔ حسان بحثیت وائس پرنسپل کی تعیناتی کے دوران ادبی سرگرمیوں اور فکری نشستوں سے متعلق اپنی جاری تحقیق کا ایک خلاصہ پیش کیا۔

اس کے بعد ممبرز عابد بروہی۔ حسن علی حسن۔ محمود خارانی۔ اصغر لعل۔ اسحاق خاموش۔ عمران فاخر اور نثار بلوچ نے اپنا اپنا کلام پیش کیا۔ استاد غلام محمد نے فیض احمد فیض کی ایک مشہور غزل ترنم کے ساتھ سنائی۔ سرشبیر حسین بلوچ نے رفیق بلوچ کی کتاب "ہمارا اپنا لیاری (مئی وتی لیاری)" پر اپنا تبصرہ پیش کیا۔ اختر بہادر نے عبداللہ ہارون کالج میں فیض صاحب کے حوالے سے کچھ پرانی یادیں شیئر کیں۔

اس کے بعد صاحب صدر نے اپنی کتاب "ہمارا اپنا لیاری" سے ایک اقتباس حاضرین کے گوش گزار کیا اور اپنی ایک نظم بھی سنائی۔ آخر میں سیکریٹری جنرل عیسیٰ بلوچ نے ممبرز کا شکریہ ادا کیا اور اس کے ساتھ ہی صاحب صدر نے نشست کے اختتام کا اعلان کیا۔ اگلی نشست آئندہ ماہ منعقد ہوگی۔

:جنرل باڈی میٹنگ

رپورٹ: جمیل احمد بزدار

سنگت اکیڈمی آف سائنسز کا کانگریس کے بعد پہلا جنرل باڈی اجلاس 25 فروری 2024 کو العابد ہوٹل میں منعقد ہوا جس کا ایجنڈ ادرج ذیل تھا:

1- سینڑل کمیٹی کے فیصلوں کی منظوری
2- ممبرشپ فیس اور سالانہ فیس
3- فنانس اور فنڈنگ
4- دیگر

جنرل باڈی کی میٹنگ شروع کرتے ہوئے سینڑل کمیٹی کی منظور شدہ تجاویز پیش کی گئیں اور میٹنگ کے منٹس پڑھے گئے۔ :

1- دوسال کے لیے ڈین فیکلٹیز، ڈپٹی ڈین کے عہدوں سمیت تمام فیکلٹیاں موخر (ڈیفر) کی گئیں۔

آئندہ کا فیصلہ اگلی کانگریس پر چھوڑ دیا گیا کہ وہ دیکھے کہ کس طرح چلنا ہے۔

اس وقت زیر تجویز سٹرکچر درج ذیل ہوگی ڈپٹی سیکرٹری کا عہدہ ختم ہو۔

سیکریٹری جنرل دیگر امور کے ساتھ ساتھ مالی امور کا بھی سربراہ ہوگا جس کے ماتحت تین سیکرٹریز کام کریں گے جن میں 1- سیکرٹری منیجمنٹ: (جوہال، فنکشن، مقالے جمع کرنا، دعوت دینا، بک اسٹال لگانا، رپورٹ اور کارروائی نوٹ کرنے کی ذمہ داریاں نبھائے گا)۔

.2 سیکرٹری لیبر (جس میں ماہی گیری، معدنیات، صنعتی مزدور، زراعت ولائیو اسٹاک اور دستکاری) کے شعبے شامل ہوں گے۔

.3 سیکرٹری کلچرلٹریچر آرٹ، تعلیم وصحت سیکرٹری منیجمنٹ کے لیے جاوید اختر، سیکرٹری لیبر کے لیے جمیل بزدار جبکہ سیکرٹری کلچرلٹریچر آرٹ تعلیم وصحت کے لیے ڈاکٹر منیر رئیسانی کے ناموں پر اتفاق کیا گیا۔ تمام سیکرٹریز کو سینٹرل کمیٹی کا تعاون حاصل رہے گا۔

2- اس کے بعد سنگت منشور جس کو ڈاکٹر شاہ محمد مری نے ڈرافٹ کیا تھا جو کہ سینٹرل کمیٹی سے منظور ہوا تھا کو جنرل باڈی کے سامنے رکھا گیا۔ منشور پڑھ کر سنایا گیا جس پر ڈاکٹر عمران نے کہا کہ منشور میں اقلیتوں کے حقوق کی بات نہیں کی گئی یہ ایڈ کیا جائے۔ چنانچہ اس نکتے کو شامل کیا گیا۔

اور اس طرح منشور کو متفقہ طور پر منظور کیا گیا۔

3- ممبرشپ فیس اکثر دوستوں نے جمع کی جبکہ باقی دوستوں کو اطلاع دی گئی کہ وہ جلد از جلد اپنی ممبرشپ فیس جمع کر دیں۔ جن چند دوستوں نے فیس جمع نہیں کی اور مسلسل تین پوہ زانت اجلاسوں میں بلا اطلاع غیر حاضر رہے، ان کی ممبرشپ آئین کے رو سے منسوخ کر دی گئی۔

اس کے ساتھ ہی جنرل باڈی کی میٹنگ اختتام پزیر ہوئی۔

سنگت ادبی نشست داڑاشم

رپورٹ: جمیل بزدار

4 مارچ 2024 کہ راڑہ شم میں سنگت ماہانہ ادبی نشست کا انعقاد ہوا۔ نشست کا احتام سنگت شاہنواز بزدار اور سنگت انجینئر فاروق بزدار کی کاوشوں سے ہوا اور نشست کی سربراہی سنگت ڈاکٹر اللہ بخش بزدار نے کی۔ مزید سنگت جاوید بزدار (اسسٹنٹ ڈائریکٹر آف کلچر بلوچستان)، سنگت محمد جان بزدار، سنگت اقبال بزدار اور سنگت نجیب بزدار نے نشست میں حصہ لیا.

چونکہ یہ ہماری اولین نشست تھی چنانچہ نشست ایک مخصوص جگہ اور وقت کے

تعین سے قاصر رہی. لیکن انشاء اللہ مستقبل میں مقام ووقت کا بھرپور خیال رکھا جائے گا.

نشست کا آغاز سنگت شاہنواز بزدار نے سنگت اکیڈمی آف سائنسز کے ادبی نشستوں اور کا تعارف کر کے کیا۔اس کے بعد سنگت ڈاکٹر اللہ بخش بزدار نے تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالی خاص کر تعلیمِ نسواں کا فقدان زیر بحث رہا.

ساتھ ہی ساتھ کتاب کی اہمیت پر بات چھڑ گئی. افسوس کا اظہار ہوا کہ کتابی رجحان ہمارے علاقوں میں نہ ہونے کے برابر ہے جو کہ ایک المیہ ہے.

لیکن کوششوں اور کاوشوں سے تعلیمی قحط پر قابو پایا جاسکتا ہے. اس کی چند مثالیں سنگت سرجاوید بزدار نے دیں کہ کس طرح قربانیوں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی جاسکتی ہے۔

بحث کی لڑی مزید آگے بڑھی اور کتاب کی گود، کتاب کی ماں لائبریری کا ذکر ہوا، یعنی کتاب کے فقدان کا حل لائبریری ہے اور لائبریری ہی وہ مقام ہے جہاں انسان کتاب سے دوستی لگا کر سوچ کی وسعتوں اور روشنیوں کو فروغ دے سکتا ہے.

لیکن افسوس اس بات کا ہوا کہ آس پاس 300 کلومیٹر کے ایریا میں کوئی لائبریری ہی نہیں موجود.

مطلب نوجوانوں کو کتابی شعور دینے کے لیے بہت زیادہ محنت کی ضرورت ہے اور اسی سے ہی تعلیمی فقدان پر قابو پایا جاسکتا ہے.

سنگت ادبی نشست اس مسئلے کی راہ ہموار کرتا ہے.

پھر نشست اپنی اختتامی لمحات کی طرف آن پہنچا.

ہر مہینے سنگت ڈاکٹر اللہ بخش بزدار کی سربراہی میں ادبی نشست کا باقاعدگی سے احتمام کا عہد کیا گیا، علاقے کے دوسرے باشعور نوجوانوں کو اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی دعوت پر غور ہوا.

موجودہ دوست آئندہ علمی و ادبی نشستوں کی دعوت وتبلیغ کا کام کریں گے اور مزید دوستوں کو مدعو کریں گے.

اس کے لیے ایک وٹس اپ گروپ بنا کر مزید اس کام میں آسانی اور کوشش کی جائے گی.

نشست میں دوستوں کی ریفریشمنٹ کے لئے چائے اور گرما گرم چپس کا بھی احتمام ہوا.

برحال نشست کا خوبصورت اختتام دوستوں میں کتابوں کی تقسیم سے ہوا.

سنگت شاہ نواز بزدار اور انجینئر فاروق بزدار نے نشست کے دوستوں کو ایک ایک کتاب وقف کی اور سنگت ڈاکٹر اللہ بخش بزدار نے سب دوستوں میں کتابیں تقسیم کیں۔ سب دوست اس بات کا پابند ٹھہرے کہ اگلے نشست تک کم از کم ایک کتاب پڑھیں گے اور اس کی review اگلی نشست میں پیش کریں گے.

اس طرح کتابوں کی خوبصورت تقسیم کے ساتھ ہی نشست کا اختتام ہوا.

☆

عابد رضا

شام کا تارا دیکھ کے ہم قسمت کو رونے لگتے تھے
صبح سویرے اٹھ کر پھر سے پتھر ڈھونے لگتے تھے
جنگوں کا موسم آتے ہی جشن منایا جاتا تھا
اور سپاہی خون میں لتھڑے خنجر دھونے لگتے تھے
مالِ غنیمت کی زنبیلوں میں کچھ ایسے وعدے تھے
شام سے پہلے بستی بستی حملے ہونے لگتے تھے
صحرا میں اک سرخ اماری آگے آگے چلتی تھی
دم بھر آنکھ جھپکتی اور ہم رستہ کھونے لگتے تھے
ناقہ بانوں کو جلدی تھی اور ہمیں یہ عادت تھی
جنگل جنگل صحرا صحرا یادیں بونے لگتے تھے
انٹرنیٹ سے جامِ جم تک حیرت جب ایجاد ہوئی
سات سمندر پار کے قصّے جادو ٹونے لگتے تھے
اک سیارے پر اترے جب، ہم کیسے قدآور تھے
اک بستی میں آنکھ کھلی تو بالکل بَونے لگتے تھے
پہلے پہل تو شہزادوں کی خاطر مسند بچھتی تھی
پھر کچھ دن میں وہ بھی اس مٹی میں سونے لگتے تھے
عہد جنوں یا عہد جوانی، جانے کیا بیماری تھی
اُن رستوں پہ کانٹے پتھر نرم بچھونے لگتے تھے
شہر پناہ کے اندر اک جادوگرنی کا افسوں تھا
دشمن خود اپنی آنکھوں میں تیر چبھونے لگتے تھے
عشق کی منزل آتے آتے سارے آہن چشم جواں
اپنے اشکوں سے پریوں کے پاؤں بھگونے لگتے تھے

سنگت پوہ زانت

رپورٹ: جمیل بزدار

سنگت اکیڈمی آف سائنسز کی ماہانہ ادبی نشست "پوہ زانت" 25 فروری 2024 کو العابد ہوٹل پرنس روڈ کوئٹہ میں منعقد ہوئی۔ کراچی سے ہمارے سنگت عیسی بلوچ بھی کوئٹہ آئے ہوئے تھے

ہزارہ سیاسی کارکنان کا وفد ضامن چنگیزی کی قیادت میں پوہ زانت میں شریک ہوا اور لیاری سے شاعر عیسی بلوچ صاحب بھی پروگرام میں شامل رہے۔

پوہ زانت اور بلوچستان سنڈے پارٹی کے بارے میں نئے دوستوں کو آگاہ کیا گیا کہ پوہ زانت سنگت اکیڈمی کی ماہانہ عملی وادبی نشست ہے جس میں دوست مختلف مضوعات پر اپنی تحریریں پیش کرتے ہیں ان پر بحث ہوتی ہے اور یہ ہر ماہ کے آخری اتوار کو منعقد ہوتی ہے۔جبکہ بلوچستان سنڈے پارٹی ایک اوپن پلیٹ فارم ہے جس میں دوست مختلف سماجی و سیاسی بحث مباحثہ کرتے ہیں اور ایک نتیجے پر پہنچتے ہیں ۔ بلوچستان سنڈے پارٹی ہر ماہ کے پہلے اتوار کو منعقد ہوتی ہے۔ مذکورہ نشستیں دو دہائیوں سے تسلسل کے ساتھ منعقد ہورہی ہیں۔

اس کے بعد جاوید اختر کو دعوت دی گئی کہ وہ زبانوں کے عالمی دن کے حوالے سے اپنا مضمون پیش کریں۔اس نے کہا کہ زبان انسان کے درمیان رابطے کا ذریعہ ہے، ہمارے ہاں بہت ساری زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن پاکستان کے بورژوا طبقات ایک ہی زبان اردو کو سرکاری زبان دینے پر زور دیتے ہیں۔

اردو زبان کی حاکمیت کے خلاف جب مشرقی پاکستان بنگلہ دیش میں احتجاج کیا گیا کہ بنگلہ زبان کو وہاں کا قومی زبان کا درجہ دیا جائے تو نہتے اور معصوم بنگالی طالب علموں کو قتل کیا گیا۔ یہ اکیس فروری کا دن تھا جس میں انتیس بنگالی طالب علموں کو بے دردی سے قتل کیا گیا۔ جس کے بعد یونیسکو نے اس دن کو ماردری زبان کا عالمی دن قرار دیا۔

ہمارا مطالبہ ہے کہ تمام سکولوں کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں ذریعہ تعلیم یہاں کی ساری قومی زبانوں میں ہوں۔ جبکہ اردو اور دیگر غیر ملکی زبانوں کو بحیثیت اختیاری مضامین میں پڑھایا جائے۔ ایک قوم کی زبان اور ثقافت دیگر قوموں کی زبانوں اور ثقافتوں پر مسلط کرنا ناجائز ہے تاکہ تمام اقوام کی زبانیں ثقافتیں بھی ارتقا پزیر ہوں اور آگے بڑھیں۔

اس کے بعد کریم نواز کیسرانڑیں کو دعوت دی گئی کہ وہ آسٹریلیا کے بلوچوں پر اپنی تحقیق سے آگاہ کریں۔ ان کے مطابق آسٹریلیا یہاں سے 12 سے 14 ہزار کلومیٹر دور ہے۔ پورے براعظم کی آبادی بہت کم ہے کراچی سے بھی کم۔انگریز جب آسٹریلیا آئے تو کوسٹل پر آباد رہے کہ اس کے جیوگرافی سخت تھی اس لیے وہ آگے نہیں جاسکتے تھے۔ پھر انگریز اونٹ اور اونٹ والوں کو ہندوستان سے لایا ۔اس میں افغانستان کے پشتون اور بلوچستان سے بلوچ تھے۔ انہی شتر بانوں کے ذریعے پھر وہ آسٹریلیا میں داخل ہوئے۔ انہوں نے وہاں مقامی لوگوں کے ساتھ شادیاں کیں۔ پہلے یہ شادیاں خفیہ تھیں۔آسٹریلیا میں اونٹوں کو جنگل میں چھوڑا گیا جہاں ان کی تعداد حد سے زیادہ بڑھ گئی تو ان کو دوسرے ممالک بھیجا جانے لگا۔وہ کہتے ہیں کہ آسٹریلیا میں ایک پروگرام کے دوران ان کی ملاقات ایک 60 سال کے مری بلوچ سے ہوئی جن کا تعلق بلوچستان سے تھا۔ان کے مطابق زیادہ تر بلوچ آسٹریلیا کے ویسٹ اور ڈیزرٹ ایریا میں رہائش پذیر ہیں۔ وہ زیادہ تر ٹرانسپورٹ کا کام کرتے ہیں۔ 1973 میں جب آسٹریلین گورنمنٹ نے سعودی گورنمنٹ کو اونٹ تحفے میں دیے تو یوسف بلوچ اور اس کی فیملی بھی ان کے ساتھ سعودی چلے گئے۔ ابھی بھی آسٹریلیا میں بلوچ ، پختون اور دوسرے سیٹلرز موجود ہیں۔

اس پر عیسی بلوچ نے پوچھا کہ بلاشبہ بہت معلوماتی لیکچر رہا وہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہاں کون کون سی زبانیں بولتے ہیں جس پر کریم نواز نے جواب دیا کہ ابر جونیز اور انگریزی زیادہ بولتے ہیں کچھ لوگ ہیں جو بلوچی بول لیتے ہیں جو بعد میں آئے۔

شاہ محمد مری نے پوچھا کہ کیا انہوں نے مذہب رکھا ہوا ہے جس کے جواب میں کریم نواز نے کہا کہ وہاں بہت پہلے ایک مسجد بنائی گئی جو آج بھی موجود ہے۔

انہوں نے مزید کہا کہ وہاں کے بلوچ کسی کے ملازم نہیں ہیں۔ان کے وہاں بہت چھوٹے چھوٹے بزنس ہیں۔

اس کے بعد ڈاکٹر شاہ محمد مری نے ماہنامہ سنگت کا ایڈیٹوریل پڑھا ، کہ الیکشن قریبا تمام کیپٹلسٹ ممالک میں یہی نتیجہ دیتے چلے آرہے ہیں جو 8 فروری کو پاکستان میں آیا۔الیکشن میں اپنی مرضی کے رزلٹس کے حصول کے لیے اسٹیبلشمنٹ چار طریقے اپناتا ہے اول وہ الیکشن سے قبل ماحول تیار کرتا ہے جس سے ان کے باہمی ایڈجسٹمنٹ کا مقصد پورا ہو، نمبر دو پولنگ کے دن والی ہیرا پھیری سے تین نتائج کے

اعلان اور ووٹوں کے گنتی کے وقت کی ہیرا پھیری اور چوتھی صدر یا سپریم کورٹ کو استعمال کر کے اپنی ناپسندیدہ حکومت کو برطرف کیا جاتا ہے۔ اس ادارے کو خوب تجربہ ہے کہ کس وقت مداخلت کرنی ہے۔ اور کوئی الیکشن ایسا نہیں گزرا جس میں مداخلت نہ کی گئی ہو۔

مجبور کیا جارہا ہے کہ بلوچ نوجوان شہری سیاست ہی ترک کر دیں۔ قرارداد، اجتماعات، تنظیم، تحریک اور تقریر کا راستہ بند ہو۔ بلوچستان کے حالیہ ماحول میں شہری سیاست کو دھاندلی سے آؤٹ کرنے کا مقصد ابھرتی ہوئی مڈل کلاس کی آواز بند کرنا ہے۔ سازش یہ ہے کہ تعلیم یافتہ اور باشعور نوجوانوں کو ہانک کر اپنی مرضی کے جنگی میدان میں دھکیل دیا جائے اور پھر انہیں خوب مارا جائے اٹھالیا جائے کچلا جائے مسخ کیا جائے۔

انہوں نے آخر میں کہا کہ چنانچہ اب حکمران طبقات کی حکمرانی برقرار ہے اور ہم عوام اب آگے چار پانچ برس تک ان کی رعایا بنے رہیں گے۔ سیاسی ورکرز کو سوچنا پڑے گا کہ جب تک عوام حکمران نہیں بن جاتے اور آج کے حکمران لوگ عوام کی رعایا نہیں بن جاتے، یہ کھیل اسی طرح جاری رہے گا۔

آخر میں ڈاکٹر ولی جان نے قراردادیں پڑھیں اور سامعین سے منظوری لی۔

یہ اجلاس:

1- الیکشن کے دوران ہونے والی تاریخی دھاندلی پر تشویش کا اظہار کرتا ہے، عوامی مینڈیٹ پر ڈاکا ڈالنے کے خلاف شدید تحفظات کا اظہار کرتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے کہ الیکشن میں ہونے والے بے ضابطگیوں پر صاف شفاف تحقیقات کی جائیں اور جو عناصر ملوث پائے گئے ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے۔

2- ہدایت لوہار کی شہادت پر گہرے افسوس کا اظہار کرتا ہے۔ ان کی فیملی سے اظہار یکجہتی کرتا ہے۔ ملزمان کے خلاف ایف آئی آر درج کی جائے اور لواحقین کو انصاف فراہم کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔

3 - چیف جسٹس کے حالیہ فیصلے کو مذہبی رنگ دینے کی مذمت کرتا ہے۔ سیاسی و مذہبی جماعتیں جماعت اسلامی، تحریک لبیک، تحریک انصاف کا سیاست میں مذہب کے استعمال کی گھناؤنی حرکت پر شدید تحفظات کا اظہار کرتا ہے۔

4 - نئی بننے والی حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ کمر توڑ مہنگائی کو فی الفور ختم کیا جائے۔

5 - سیاست میں اسٹبلشمنٹ کا کردار ختم کیا جائے اور عوام کے منتخب نمائندوں کو فیصلوں کا حق دیا جائے۔

6 - اٹھارویں ترمیم پر فی الفور عمل کیا جائے۔ صوبوں کو مکمل اور بااختیار نمائندگی دی جائے۔

7 - تعلیم سستی ہو، عام ہو، سائنسی ہو، مادری زبان میں ہو اور تعلیمی ادارے معیاری ہوں

8- جاگیر داروں پر زرعی ٹیکس لگایا جائے تمام صوبوں بشمول بلوچستان میں زرعی اصلاحات کی جائیں۔

9- اٹھارویں ترمیم کے مطابق گیس، تیل، کاپر، سونا، کرومائیٹ، جپسم، بینک و بیمہ کمپنیاں صوبائی حکومت کے حوالے کی جائیں۔

10- سٹوڈنٹس یونینز کو بحال کیا جائے۔ ان پر پابندیوں کو فی الفور ختم کیا جائے

11 - زرعی اصلاحات کا کیس 20 سال سے سپریم کورٹ میں پڑا ہوا ہے اسے کورٹ میں باقاعدہ پیش کیا جائے۔

12- عورتوں کی زندگی آسان بنانے کے لیے پینے کا صاف پانی، بجلی، گیس فراہم کی جائے۔ ان کو صحت اور تعلیم کی سہولیات فراہم کی جائیں۔

13- سرداری نظام کے خاتمے کے لیے نصف صدی سے بلوچستان اسمبلی کی قرارداد قومی اسمبلی میں پڑی ہوئی ہے اسے قومی اسمبلی و سینٹ سے پاس کرا کر آئینی شکل دی جائے۔

آخر میں سیکریٹری جنرل نے اپنے ریمارکس دیئے اور کہا کہ جاوید اختر کا مضمون نہ صرف مطالعاتی و تحقیق پر مبنی مضمون تھا بلکہ جاوید صاحب نے بڑی مہارت سے انٹرنیشنل واقعات سے لے کر اس کو پاکستان اور پھر بلوچستان سے جوڑا اور قومی زبانوں پر ایک بھرپور مضمون پیش کیا۔ کریم نواز بلوچ نے آسٹریلیا کے بلوچوں پر بہت مفید اور موثر معلومات ہم تک پہنچائیں۔ انہوں نے ایڈیٹوریل پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ الیکشن کے بعد نوجوان مایوس ہوگئے ہیں تاہم ہمیں اپنا گراؤنڈ خالی نہیں چھوڑنا ہے، تقریر تنظیم اور تحریر کی آزادی پر مزید زور دینا ہے۔ آخر میں انہوں نے ہزارہ وفد اور عیسی بلوچ سمیت تمام دوستوں کا شکریہ ادا کیا اور امید کا اظہار کیا کہ ہم سیکھنے اور سکھانے کا یہ عمل اسی طرح جاری رکھیں گے۔

غزل

محمد رفیق مغیری

تیرے بنا وقت کٹتا نہیں
تجھ سے دھیان ہٹتا نہیں

درد والم میں گزرتی ہے زندگی
خوشی کا کوئی دن پلٹتا نہیں

اشک آنکھوں سے تھم گئے
مگر درد کا ابر چھٹتا نہیں

علاجِ مرض تو کی ہے بہت
پر ترے بِن درد گھٹتا نہیں

ہجوم میں ترا تصور ساتھ ہے
تنہائی میں تو لپٹتا نہیں

رفیق روز انبارا کھٹے کرتا ہوں
مگر درد تنہائی سمٹتا نہیں

گندم کی روٹی

اشرف ملک

ایک مختصر ناول ہے جسے عبدالستار پرُدلی نے بلوچی زبان میں تحریر کیا تھا۔ جس کا ترجمہ بلوچی سے اردو میں ڈاکٹر شاہ محمد مری نے کیا ہے۔ یہ مختصر سا اردو میں ترجمہ شدہ ناول پانچ ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب میں سوشلزم نظام اس کی بہتری اور اس کے ثمرات کو خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ جو سنگت اکیڈمی اف سائنسز کوئٹہ بلوچستان سے 2023 میں تیسری بار شائع ہوا ہے۔ یہ مختصر سا ناول انقلابِ روس اور لینن کی اس یاد کو تازہ کرتا ہے جو اکتوبر 1917 میں روس میں مزدور طبقے کی پارٹی اور لینن کی سربراہی میں سوشلسٹ انقلاب برپا ہوا . جس کے تناظر میں ظلم و جبر کا قدیم محل سرنگوں ہو گیا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد جب سوشلسٹ کیمپ قائم ہو گیا تو دنیا میں ہر جگہ محنت کشوں کی تحریک مضبوط ہوئی اور عالمی سامراج اور استصالی جونکوں کے اندر کھلبلی مچ گئی اس نے سوشلسٹ کیمپ اور اس کے سربراہ سوویت یونین کے خلاف سرد جنگ شروع کر دی۔ امریکی سامراج اور اس کے حواریوں نے سوشلسٹ ملکوں کے خلاف اسلحہ کے انبار جمع کیے اور ان مہلک ہتھیاروں کو سوشلسٹ کیمپوں اور ان سے وابستہ مزدور تحریکوں کے خلاف استعمال کرنا شروع کیا۔ روس کے اکتوبر 1917 کے انقلاب نے دنیا میں ایک سرخ لکیر کھینچ دی تھی جہاں ایک طرف مزدور، کسان، روشن فکر اور محنت کش تھے اور دوسری طرف عوام دشمن سیٹھ، جاگیردار، سامراج اور کمپراڈور۔ اس انقلاب نے زلزلے کی طرح دنیا کو متاثر کیا۔ یہ ناول بنیادی طور پر ' گندم کی روٹی ' کو ترسنے والے افغانستان کے پسماندہ گاوں میں رہنے والے ایک مزدور دل مراد، محمد خان ، مرید ، شاہ پری اور ڈرخاتون کیخاندان کی کہانی ہے. جو اپنے گاؤں کے فیوڈل حاجی خان, اللہ داد اور اس کے منشی ملا عبدل کہ ظلم سہتے اور ' گندم کی روٹی ' کو ترستے اپنی زندگی گزار رہے تھے. اللہ داد کا دل مراد کی بہن شاہ پری کی عزت لوٹنے کی کوشش کرنا، اور زبردستی فیوڈل حاجی خان کا اپنے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے شاہ پری کا رشتہ داد خدا سے کر دینا جو کہ 70 برس کا بوڑھا شخص ہے اور اس سے لب کے طور پر 20 بھیڑیں لینا اور ملا عبدل کو بھی ایک لیلا دینا, دل مراد اور اس کے بھائی کا اپنی بہن کی عزت بچانا, شاہ پری کا خودکشی کرنا , دل مراد اور محمد خان کو حاجی خان کا سزا دینا اور 10 سال کے لیے جیل بھجوا دینا , جہاں پر دل مراد اور اس کے بھائی محمد خان کے اور ان کے گاؤں کے دن بدل جاتے ہیں کہ جہاں پر " گمشاد " نامی افغانستان کے خلق ڈیموکریٹک پارٹی اور سوشلزم، مزدور تحریک پارٹی کے ہیرو سے یہ ملاقات ہوتی ہے, جیل کے ان دس سالوں میں دل مراد اور اس کا بھائی محمد خان " گمشاد " سے مزدور تحریک سوشلزم یا لینن کے اس نظریے کے پرچار کو سیکھتے ہیں اور رہائی کے بعد اپنے گاؤں کے فیوڈل حاجی خان، اللہ داد اور اس جیسے دیگر فیوڈلز سے بدلہ لیتے ہیں۔ اور مزدور تحریک کو عالمی مزدور تحریک کے طور پر کا۔

زخمی اعتبار

عطیہ داؤد

جب اعتبار کے گھنے پیڑ میں سے
رشتہ خشک پتے کی طرح جھڑ جائے
تعلق سندھو دریا میں
ریت کے ٹیلوں کے درمیاں
چلو بھر پانی جتنا رہ جائے
انہی راہوں پر چلتے ہوئے
اچانک تم سے ملاقات پر
میرے نینوں سے چھلکا ہوا پانی
تمہاری محبت کا اعتراف نہیں
اس محبت کی کوئی بھولی بسری یاد ہے

غزل

فاطمہ حسن

قبر پہ پھول بچھاتی ہوں
پھر تتلی بن جاتی ہوں
جنگل کے رستے سے اب
دریا تک ہو آتی ہوں
بھولنیوالی چیزوں کی
اک فہرست بناتی ہوں
پربت کتنا اونچا ہے
جانے سیگھبراتی ہوں
کھاء کتنی گہری ہے
سوچتے ہی ڈرجاتی ہوں
سبز سمندر سبز نہیں
سچ ہی تو بتلاتی ہوں
پس منظر ہی سچا ہے
منظر کو جھٹلاتی ہوں
پتھر بن کے لہروں سے
ٹکراتی , اٹھلاتی ہوں
کارستانی عشق کی ہے
تنہا ہوتی جاتی ہوں

خاخرناراج

آغا گل

یوحنا سرد کمرے میں کانپے جا رہا تھا۔ساتھ کی منجی پر اس کی بیوی مارگریٹ اور بچی الزبتھ سانسیں روکے منجمد سی پڑی تھیں۔سہ پہر میں سوئی گیس والے پولیس کے ہمراہ آئے تھے اور محلے بھر کی گیس کاٹ کر چلتے بنے۔گیس کی قیمت اچانک ہی کیئر ٹیکر حکومت نے 610 فی صد بڑھا دی تھی۔یہ سوچے بغیر کہ کیا عوام کی بھی قوت خرید 610 فی صد بڑھ چکی ہے۔وہ یہ کمر توڑ قیمت کیسے ادا کریں گے۔یوحنا تو کچھ نہ بول پایا۔یسوع مسیح کے ارشاد ''جو قیصر کا ہے قیصر کو اور جو خدا کا ہے خدا کو ادا کرو'' کے تحت مسیحی سرکار سے نہ لڑتے۔دہ یکی دیتے اور کچھ اس سے بڑھ کر پادری کو۔جو خدا کے نام پر چندہ جمع کیے جاتا۔کائنات کے مالک کے لیے ماہانہ اور پھر اتوار کے اتوار چرچ میں ہدیہ کے لیے پھرائی جانے والی ٹوکری میں رقم ڈالنا اس کی بھی عادت تھی۔ان کا رہا سہا دم جڑانوالہ حملے میں نکل گیا تھا،مسیحی آبادی پر حملے ہوئے۔ املاک اور چرچ تباہ کیے۔سرکار نے لاپرواہی لاتعلقی سے دیکھا۔کئی مساجد کے لاؤڈ سپیکر بھی خاموش رہے،گیس کٹتی دیکھ کر یوحنا دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔مگر خاموش ہی رہا۔کیا خبر اسی کے گھر پہ پل پڑیں۔وہ بے بسی سے دیکھا کیا۔لکڑی بھی خاصی مہنگی تھی۔بجلی کا ہیٹر تو تباہ کن تھا۔اتنی بڑی قیمت وہ بھلا کیسے دیتا۔وہ التجائیں کرتا رہا۔مگر سرکاری اہل کاروں نے ایک نہ سنی۔قوم والے چند نوجوانوں نے بہ زور طاقت روکنا چاہا تو پولیس ہتھکڑیاں لگا کر دھکے دیتی ساتھ ہی لے گئی۔وہیں باتیں ہو رہی تھیں کہ سوئی گیس کے لیے الگ سے تھانہ بھی ہے۔جو گیس چوری کو غداری کے برابر عمر قید کی سزا دلواتا ہے،سرکار نے خوف زدہ کرنے والے قانون بنا رکھے تھے۔یوحنا نے محلے کو انسانوں کا سرد قبرستان بنتے دیکھا۔تو تک کی اجتماعی قبر میں زندہ انسان سسک رہے تھے۔وہ کہیں سے گٹکے تو لے آیا۔مگر لکڑی میں وہ حدت کہاں۔خداوند کے سوا کوئی آسرا نہ تھا۔

سرد رات سیاہ مہیب اور ظالم تھی۔وہ اپنے ذہن سے دل میں کتاب مقدس کی آگ سے متعلق آیتیں منتقل کرنے لگا۔جب آگ کا نام آتا تو لحاف کمبل میں یخ بستہ مارگریٹ کو بھی کلام سے کچھ طاقت ملتی۔یوحنا اپنی یادداشت کے سہارے دھیمی مگر ایمانی آواز میں بولنے لگتا۔'' کان لگاؤ اے آسمانو! اور میں بولوں تو آگ آسمان سے نازل ہو۔آگ آسمان سے نازل ہوئی۔گندھک اور آگ آسمان سے برسائی...... ایک جھاڑی میں آگ لگی ہوئی ہے......اور آگ زمین تک آنے والی ہے...... . آگ اور بادل کے ستون میں بھسم کر دینے والی آگ کی مانند تھا......اور مذبح کی آگ اس پر جلتی رہتی...... . مذبح پر آگ جلتی رہے...... .وہ مسکن پر آگ سا دکھائی دیا...... . خداوند کی آگ ان کے درمیان جل اٹھی......اور خداوند کے حضور سے آگ نکلی......خدا بھسم کر دینے والی آگ ہے......خدا کی آواز......آگ میں سے آتی ہوئی'' آیات پڑھنے سے اسے طاقت ملتی جو روحانی طور پر اس کی بیوی اور بیٹی کو منتقل ہوتی رہی۔آگ کے بارے میں آیات کے لیے وہ اپنے دماغ پہ زور ڈالتا رہا۔اچانک ہی سلاطین کی آیت گرم جھونکا لیے دل پہ اتری'' جو آگ سے جواب دے وہی خداوند...... . ہمارا خدا بھسم کرنے والی آگ ہے...... اور یعقوب کی آیت'' زبان بھی ایک آگ ہے'' تو کیا انسان زبان سے بھی حدت حاصل کر سکتا ہے۔وہ سوچنے لگا۔ویسے کچھ گرمی تو جسم میں اتر آئی تھی۔یوحنا کی آواز مستحکم،پاٹ دار اور پرتاثیر تھی۔سیلی سیلی رات دل میں دانت گاڑے مسلط تھی۔

اچانک ہی باہر کچھ شور و غوغا ہوا۔ہنگامہ زور کا تھا۔اس سرد تابوت اور سڑک کا فرق مٹ چکا تھا۔وہ جیسے تیسے باہر نکلا۔کمبل سے بکل مار لی تھی،چہرے پہ چادر سے مول کیا تھا۔اب صرف اس کی آنکھیں ہی سردی کا مقابلہ کر رہی تھیں۔کامریڈ ناصر کچھ ہی روز قبل جیل سے رہا ہو کر آیا تھا۔وہ بھی گھر میں کانپے جا رہا تھا۔اچانک ہی اس کی بیٹی زور زور سے رونے لگی'' بابا مجھے بچالو میں مر رہی ہوں'' ناصر نے لحاف ہٹا کر چہرہ دیکھا بیٹی نیلی پڑ چکی تھی۔اس کے دل میں تو حکمران خاندانوں کے لیے نفرت اور حقارت بھری ہوئی تھی۔اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ وہ پائپ رینچ لے کر گھر سے باہر نکلا'' سردی سے مرنے کی بجائے سرکار کی گولی سے مر جاؤ۔بزدلو! اس نے اہل محلّہ کو للکارا'' اور رینچ کی مدد سے گیس کھول دی۔پل بھر میں اس کے اہل خانہ جی اٹھے۔ہیٹر کی جاں بخش آگ نے سبھی کو نئی حیات بخش دی۔تبھی تو آگ کو مقدس سمجھا جاتا رہا۔اس برفانی رات میں تو گور بچ کی چیخوں نے ثابت کر دیا کہ آگ میں تقدیس ہے۔آہور مزدا بھی آگ میں ظاہر ہوتا ہے۔

چائے بنی،گفتگو ہونے لگی۔انگڑائی لیتی ہوئی زندگی آگ میں سے باہر چلی آئی۔کامریڈ اہل محلّہ کا پرومیتھیس ثابت ہوا۔کئی لوگوں نے اس سے رینچ لے کر گیس کھولی اپنی گھرانوں کو زندگی لوٹانے لگے۔سبھی بے تابی سے آگ تاپنے لگے۔گھر خوشیوں کے گھوارے بنتے چلے گئے۔

یوحنا کی ہمت نہ پڑی کہ وہ ایسا دلیرانہ اقدام کرے۔وہ سلاطین کی آیت

دہراتا چلا گیا۔وہ سوچنے پہ مجبور ہوا کہ اگر اس ظلم ناروائی پہ خدا خفا ہو تو ارشاد ہے''میرے غصّے کے مارے آگ بڑھ اٹھی.....جو آگ سے جواب دے وہی خدا ہے''

یوحنا کانپتا ہوا اپنے egloo میں چلا آیا۔اس نے بتایا کہ دیگر اہل محلّہ نے گیس کھول لی ہے،مگر اس پر تو اقلیت کی تہمت چسپاں تھی اس پہ توہین لگا کر ہی مار ڈالیں گے،پھر ڈبل کیبن کے پیچھے باندھ کر شہر بھر میں گھماتے رہتے ،لوگ تالیاں پیٹتے۔مارگریٹ نے بھی اس کی حوصلہ افزائی کی''ہمیں بھوکے شیروں کے آگے ڈالتے تھے اب سردی سے مار رہے ہیں۔اچھا کیا تم نے قانون نہ توڑا''۔

یوحنا نے آیت میں جواب دیا''خدا روح ہے اور ضرور ہے کہ اس کے پرستار روح اور سچائی سے پرستش کریں''

مارگریٹ نے ایمانی طاقت کو بڑھایا''جلد ہی صبح ہو جائے گی۔پھر ہم کچھ انتظام کرلیں گے۔یوں بھی سورج کی تپش مفت چلی آتی ہے''

بیوی کی ایمانی کیفیت سے یوحنا کا حوصلہ بڑھا''اے خداوند میں تیری منت کرتا ہوں کہ ہمارے بیچ میں ہو کر چل''رات رینگ رہی تھی۔

''حکمران خاندانوں کو پالنے کے لیے۔ہزار چھ سو ارب کی مراعات انہیں دی جاتی ہیں۔جن کے لیے ہمیں کولہو میں نچوڑا جاتا ہے۔انہیں اربوں روپے کے قرض دیئے جاتے ہیں۔پھر وہ قرض معاف کر دیے جاتے ہیں''

یوحنا پھر آیات کے سہارے جینے لگا۔

''خداوند خدا نے آگ کو بلایا.....اس کا قہر آگ کی مانند نازل ہوتا.....اس کی غیرت کی آگ کھا جائے گی.....ہر شخص آگ سے نمکین کیا جائے گا.....اس آگ میں جائے جو کبھی بجھے گی نہیں..... وہ تمہیں روح القدس اور آگ سے بپتسمہ دے گا.....یوحنا آگ کا خواہش مند تھا کہ کمرے میں آگ ظاہر ہو۔وہ دہراتا چلا گیا''ہمارا خدا بھسم کرنے والی آگ ہے''جاگتے اونگھتے سرد نیند میں تیرتے ڈوبتے ابھرتے ٹھٹھرتے رات کٹی۔پھر سورج آگ لیے کوہ مردار کے عقب سے نمودار ہوتا چلا گیا۔گٹکے کام آئے۔آگ بیک وقت حدت بھی دے رہی تھی ناشتہ بھی تیار کر رہی تھی۔پانی بھی ابال رہی تھی۔انہیں پہلی بار احساس ہوا کہ آگ ہی زندگی ہے۔پرومیتھیس کتنا بڑا کام کرتا گیا۔کسی قوم نے بھی اسے Canonized نہ کیا۔بس داستانوں میں لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا۔گھر کو تالہ لگا کر وہ حسب معمول بائیک پر روانہ ہو گئے۔ان کے علاوہ گھر میں کوئی بھی قیمتی سامان نہ تھا۔ویسے محلّہ بھی محفوظ تھا۔عقیدوں کی نفرتیں محلّہ سے باہر پلتی تھیں۔

یوحنا نے مٹی کے تیل کا چولہا اور کچھ گٹکے بھی خرید لیے تھے۔کیشئر نے اسکی درد بھری کہانی سن کر تنخواہ میں سے کچھ ایڈوانس رقم تھما دی تھی۔''ان ظالموں کو خدا غارت کرے۔یہ ریڈزون والے عوامی نمائندے نہیں ریڈ لائٹ ایریا کے دلال ہیں۔ان کی ہیرہ منڈی بندوقوں کی چھاؤں تلے تماش بینوں کے لیے سجتی ہے''۔یہ سب کچھ ایک وقتی سہارا تھا۔کیونکہ مسلسل مٹی کا تیل یا گٹکا خریدتے رہنا ممکن نہ تھا۔یا پھر ڈھاڈر تبدیلی کروالیتا جہاں سورج سوا نیزے پہ سال بھر ٹکا رہتا۔

ان کا محلّہ سوگوار ہو چکا تھا۔محکمہ سوئی گیس کو رات کی کاروائی کا پتہ چل گیا تھا۔بہت سے لوگ دھر لیے گئے۔تھانہ بھی بھاؤ تاؤ کر رہا تھا کہ گیس چوری پر عمر قید کا مقدمہ بنائیں یا جرمانے کا۔پروسیکوٹر کا بھی تو پیٹ بھرنا پڑتا ہے۔شکر ہے کہ عورتوں کے طلائی زیور وقت پر کام آئے۔کامریڈ ناصر نے سر بچانے کو بائیک گروی کر دیا کہ رقم ادا کر کے وہ تھانے سے لے جائے گا۔

اسی روز اہل محلّہ کا اجلاس بھی ہوا کہ اتنی بڑی قیمت گیس کی وہ بھلا کیسے ادا کرتے رہیں گے۔یہ بھی تسلی تھی کہ دو ماہ کی ہی تو بات ہے۔پھر سردی ختم ہو جائے گی۔صرف کھانا پکانے کے لیے گیس کی ضرورت ہوگی۔گیس کمپنی کے ملازمین بھی مسلمان تھے ان کے دل نرم تھے۔ان کی مٹھی گرم کی تو انہوں نے بڑے بڑے بل قسطوں میں تقسیم کر دیئے۔

محلے بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔انسان دوبارہ جی اٹھے۔سسکتی بلکتی زندگی دوبارہ بیساکھیوں پہ چلنے لگی۔کامریڈ ناصر اب مسجدوں میں جانے لگا۔ایک ایک سے کہتا کہ لاکھوں نمازی اگر مطالبہ کریں۔جمعہ کے خطبہ میں گیس کا نرخ 610 فی صد بڑھانے پر اعتراض کیا جائے۔تو یہ قتل عام رک سکتا ہے۔'' یہ گیس کے نرخ ہی نہیں بڑھے بلکہ یہ Genocide ہے۔سرکاری سطح پر عوام کا قتل عام ہے۔ٹارگٹ کیلنگز کے بعد یہ نیا حملہ ہے۔کیا سرکار چین کی طرح پاکستان کی آبادی کم کرنا چاہتی ہے؟'' ۔کامریڈ ناصر تقریریں کرتا پھرا۔لوگوں کے کانوں پہ جوں تک نہ رینگی۔البتہ کچھ دانشوروں نے سمجھایا کہ عقل کے ناخن لو۔تمہارا ہی ہم نام کامریڈ حسن ناصر پولیس تشدد سے مارا گیا تھا۔ہمارے وطن کے قیام کا مقصد ہی تھا کہ چینی۔روسی اثرات روکے۔سوشل ازم کمیونزم کے مقابل سد سکندری بن جائے برصغیر کو سپر پاور نہ بننے دے۔امریکی مفادات کے لیے خم ٹھونک کر کھڑا ہو۔مگر کامریڈ ناصر پہ کوئی بھی اثر نہ ہوا۔وہ اپنے ہم خیال پیدا کرنے میں مزید اکیلا ہوتا چلا گیا۔انقلابی کی موت آتی ہے تو وہ مسجد کا رخ کرتا ہے۔جمعہ کے روز خطبہ سے پہلے اس نے مائیک چھین کر دھواں دار تقریر کر ڈالی کہ دوزخ کی آگ کا کچھ حصّہ ابھی سے مانگ لیا جائے۔نہایت ہی خشوع وخضوع سے اپنے اپنے حصّے کی آگ مانگ کر اس سے گھر گرم کیے جائیں۔محکمہ سوئی گیس جو شائی لاگ کی طرح گوشت جسم سے کاٹتا ہے۔اس سے بھی جان چھٹ جائے گی۔یوحنا اس کی سوچوں سے مطالبوں سے ہراساں تھا۔

ایک روز کوئٹہ ایش کے چھتناور درخت کے نیچے قائم لندن ہوٹل لے گیا۔میز بجا بجا کر باہر والے کو متوجہ کیا۔'' دودھ پتی۔دو دانہ۔'' اس نے چائے کا آرڈر دیا۔

'' ناصر بھائی جنکشن چوک سے لیاقت بازار میں داخل ہوئے تو ون وے کی وجہ سے بتی ٹوٹے گی بائیک لگے گا۔ٹریفک روند کر چلی جائے گی۔عقل نوں ہتھ پاؤ اولے مٹی پاؤ۔قسطیں ہو رہی ہیں۔ہم جیتے بھی تو قسطوں میں ہیں''

کامریڈ کو یوحنا بالکل الو سا لگا '' یوحنا بھائی تم لوگوں کو اقلیت قرار دیا گیا۔حالانکہ تم لوگ تھوما رسول کے ساتھ پہلی صدی عیسوی میں آئے تھے جبکہ ہم لوگ عرب حملہ آوروں کے ساتھ آٹھ سو برس بعد میں سندھ آئے تھے۔تم لوگ توھین کے ڈر سے گھروں میں بھی ڈرتے ہو تمہاری سوچ بزدلانہ ہے''

باہر والا چائے میز پہ پٹخ گیا۔یوحنا نے رسان سے کہا۔'' ہم بزدل ہوتے تو عقیدوں پر قائم نہ رہتے یسوع مسیح نے فرمایا۔جان دینے تک بھی وفادار رہ تو میں تجھے زندگی کا تاج دوں گا۔ہم تو حیات کا ابدی تاج پہننے والے لوگ ہیں ''۔

لب دوز،لب سوز،لب ریز چائے حلق میں انڈیل کر ناصر کچھ پرسکون ہوا'' تم کیا چاہتے ہو؟ میں یہودہ اسکریوتی بن جاؤں ؟ یسوع کو فروخت کر دوں تیس مثقال میں؟''

یوحنا مسکرایا'' بھائی مجھے تمہاری زندگی چاہیے۔تم سچے اور کھرے انسان ہو۔میں بڑی وحشت ناک خبریں سن رہا ہوں۔مسجد سیاست کا اکھاڑہ تو نہیں۔تم وہاں جا کر روحانیت بخش کی بجائے گیس کی قیمت کم کرنے کی باتیں کرتے ہو۔دوزخ کی آگ اسی دنیا میں مانگتے ہو۔لوگ تمہیں بدعتی کہتے ہیں''۔ ناصر لاتعلقی سے چائے پیتا رہا۔اسے یوحنا پہ ترس آ رہا تھا۔بیچارہ بیوی کی ایک طلائی بالی فروخت کر کے گیس کا بل ادا کر آیا تھا۔عورت کے تو صرف دو کان ہوتے ہیں،کوئی ہزار نہیں کہ ہر ماہ ایک بالی اتارتا چلا جائے۔بہت ہی بحث کے بعد بھی ناصر لوئے غر کی طرح جما ہوا سینہ تانے کھڑا تھا۔'' میں انقلاب لانا چاہتا ہوں یوحنا،لوگوں کو جگانا چاہتا ہوں'' یوحنا کے لہجے میں مایوسی غالب آ رہی تھی۔

'' ناصر بھائی یہ ملک دو قومی پر بنا تھا:جوتے کھانے والے۔جوتے مارنے والے۔قتل کرنے والے قتل ہونے والے۔ہمارا تعلق دوسری قوم سے ہے محکوم قوم سے''

اس روز کی ملاقات بے ثمر رہی۔مگر یوحنا بھی ہار ماننے والا انسان نہ تھا۔ناصر کی مخالفت بے حد بڑھ گئی،سرگوشیاں کھلے عام گفتگو میں بدل گئیں۔اور پھر نعروں میں ڈھلتی چلی گئیں۔

ایک رات یوحنا دوڑا چلا آیا۔وہ دیوانہ وار دروازے پہ دستک دیئے جا رہا تھا۔ناصر اس کے باوجود سکون سے باہر نکلا۔''خیر باشد!''

یوحنا کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

'' ناصر بھائی بہت گڑ بڑی ہے۔بلوہ ہونے کی باتیں سن کر آیا ہوں تم خطرے میں ہو میرے گھر بچوں سمیت چلے آؤ'' ناصر کو ناگوار گزرا'' کیوں تم مجھ سے زیادہ طاقتور ہو گیا؟''

یوحنا اب التجاؤں پہ اتر آیا تھا'' ایسا نہیں ہے۔مگر انہیں علم نہ ہو گا کہ تم میرے پاس ہو''

ناصر کو یوحنا کی تشویش پر تعجب ہوا'' وہ دیکھو چوک پر رات کو پولیس کا پہرا لگتا ہے۔یوحنا بھائی وہمی نہ بنو۔جاؤ آرام سے سو جاؤ'' یوحنا کو لگا جیسے اس نے تین بار مرغ کی بانگ سنی ہو۔وہ بوجھل قدموں سے گھر چلا آیا۔کھانا کھا کے رقم بچانے کے لیے گیس بند کی اور لحافوں میں دبک گئے سردی کے باعث گفتگو موقوف تھی۔

رات گئے اسے مارگریٹ نے آوازیں دے کر جگایا۔

'' لگتا ہے تمہاری دعائیں قبول ہو گئیں دیکھو فضاء ▯ گرم ہو گئی ہے۔آگ اتر آئی ہے'' فضاء میں واقعی تپش اور حدت تھی۔اچانک ہی وہ کانپ کانپ گیا۔وہ باہر لپکا گھر کے دروازے کی کنڈی کھول کر سڑک پہ نکلا اور چکرا کے رہ گیا۔مگر ہمت کر کے بڑھا۔کامریڈ ناصر کا گھر آگ میں جل رہا تھا۔گھر کے باہر کسی نے قفل لگا کر رکھا تھا۔آگ کی تپش سے محلّہ گرم ہوئے جاتا تھا۔یوحنا کے لیے آگ کی جانب بڑھنا ممکن نہ تھا۔چوک کے پولیس والے مکان کی آگ تاپ رہے تھے۔بہت دنوں سے وہ سرد راتوں میں قلفی ہوتے رہے تھے۔وہ خدا کا شکر ادا کر رہے تھے کہ ایک رات تو آگ تاپتے آرام سے گزرے گی۔یوحنا ڈگمگاتا ہوا اپنے گھر کی دہلیز پہ آ بیٹھا۔

" Though He Slay me Yet in Him Will Wait"

خاخرناراج: آگ کی بادشاہی

دہ یکی: دسواں حصّہ

کرہ لمردار: دھوپ دینے والا پہاڑ جو کوہ مردار مشہور ہے۔

لوئے غر: بلوچستان کی سب سے بلند چوٹی .Though He آیت یعقوب[13] 5/

غزل

ڈاکٹر منیر رئیسانی

یادوں کے دریچوں سے خوشبوئے حنا گزری
سنجد کے درختوں سے جس وقت ہوا گزری
اک رقص _ تحیر تھا، اک نغمۂ بیگانہ
آواز کے مقتل سے یہ کیسی صدا گزری
کچھ میں تھا، ذرا تم تھیں بادام کے سائے میں
شاید کہ جنم گزرا، دھیرے سے ہوا گزری
تا حدِ نظر ریزے بکھرے چلے جاتے ہیں
یہ کیسی گھڑی تجھ پر اے دشتِ انا گزری
گلرنگ ہر اک لمحہ، ویران ہر اک ساعت
پہلو میں ترے بیتا، جو تجھ سے جدا گزری

لاش بول رہی ہے

غنی پرواز

''ایک لاش بول رہی ہے۔۔۔''

اُس دن جب میں نے بازار میں کسی سے یہ انوکھی خبر سنی تو بالکل یقین نہیں آیا۔ بات بھی یقین کرنے والی نہیں تھی۔ لاش کا بولنا انہوئی سی بات تھی۔

''آپ یہ کیسی بات کر رہے ہیں۔۔۔ بھلا لاش بھی کبھی بولتی ہے؟'' میں نے حیرت کا اظہار کیا اور کہنے والے کی جانب بے اعتمادی سے دیکھا۔ خود جا کر دیکھیے۔۔۔'' کہنے والے نے خود اعتمادی سے کہا۔ کہاں ہے؟ یقین نہ کرنے کے باوجود دل میں ایک تجسس سی پیدا ہوئی۔۔۔

''کہاں ہے وہ لاش!؟''

''چلیئے۔۔۔ دکھاتا ہوں آپ کو۔۔۔''

''چلیئے۔۔۔''

وہ شخص مجھے بازار کے بیچوں بیچ ایک چھوٹے سے قبرستان میں لے گیا۔ جہاں لوگوں کے ایک جم غفیر نے ایک پرانی قبر کو گھیر رکھا تھا۔ لوگوں کے درمیان سے راستہ کے قریب پہنچا، تو اُس شخص کی بات ہے بات سچ نکلی۔ وہاں ایک لاش ہڈیوں کے ڈھانچے کی شکل میں پڑی ہوئی تھی۔ اور اُس سے مسلسل ایک ہی آواز آرہی تھی۔

''میں پانچ سو سال پرانی لاش ہوں۔ مگر اب زندہ ہونا چاہتی ہوں۔ زندہ ہونا چاہتی ہوں۔۔۔''

سارے لوگ خاموش تماشائی بنے کھڑے تھے۔ کچھ دیر تک میں بھی اُنہی کی مانند خاموش تماشائی بنا رہا۔ لیکن زیادہ دیر تک میں خاموش نہ رہ سکا۔۔۔

''تم چاہے کوئی بھی ہو، مگر مر چکے ہو۔ اور مرنے والے زندہ نہیں ہوا کرتے۔۔۔''

''میں مرا نہیں، مار دیا گیا ہوں۔۔۔''

مرے ہو، یار مار دیئے گئے ہو۔۔۔ ایک ہی بات ہے۔ تم دوبارہ زندہ تو نہیں ہو سکتے''۔

''آخر کیوں زندہ نہیں ہو سکتا؟''

''اس لئے کہ آج تک کوئی مرنے والا زندہ نہیں ہوا۔۔۔''

''کیا یہ بات تم یقین سے کہہ رہے ہو؟''

''کیوں نہیں؟'' کہنے کو تو میں نے کہہ دیا۔ لیکن پھر سوچ میں پڑ گیا۔۔۔ کیونکہ مجھے اپنے اس دعوے کی صداقت پر شک سا ہوا۔

''کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟''

خیر، اگر مان بھی لیا جائے کہ تم زندہ ہو سکتے ہو۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

''کیسے؟''

''یہ بات تو میں نہیں جانتا۔۔۔ مگر جاننا ضرور چاہتا ہوں۔۔۔''

ہماری بحث بحثی کے دوران، میں نے محسوس کیا کہ اب لوگوں میں خاصی بے چینی پیدا ہوئی ہے۔ اور اُن میں سے کئی لوگ اپنی خاموشی توڑ دینا چاہتے ہیں۔

"مجھے لگتا تا ہے یہ شخص موت وحیات کی کشمکش ش : میں مبتلا ہے۔ سورہ یسین اس کا علاج ہوگا۔ اور وہ اس عقیدے کے ساتھ سورہ یسین پڑھنے لگا، کہ اُسے سُن کر، اُس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر جائے گی۔۔۔ لیکن اُس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔۔۔

آواز اُسی طرح برقرار رہی۔۔۔

ایسی ترکیبوں سے مجھے زندہ ہونے سے روکا نہیں جا سکتا۔۔۔

" ڈنڈا ہاتھ میں لیے ایک غصیلا پولیس والا آگے بڑھا۔

''شاید اسے کچھ ڈنڈوں کی ضرورت ہے۔۔۔ دیکھیئے ابھی اس کی موت کا سامان ہو جائے گا۔۔۔'' اس کے ساتھ ہی اُس نے پے در پے کئی ڈنڈے چلائے۔۔۔ اس قسم کی زیادتیاں بھلا میرا کیا بگاڑ سکتی ہیں؟'' جدید اسلحہ سے لیس ایک مغرور فوجی آگے بڑھا۔ اس کا آخری فیصلہ چند گولیاں کر لیں گی۔۔۔ ابھی، اسی وقت یہ دوسری دنیا کو سدھارے گا۔۔۔ یہ کہہ کر اُس نے بہت سی گولیاں برسائیں۔۔ لیکن اُن کا اثر الٹا ہوا۔۔۔ اور اُس کی آواز اور زیادہ بلند ہوگئی۔۔۔

''ایسے مظالم کا بھلا کیا نتیجہ نکل سکے گا ؟''

ایک مستانہ شاعر دوستانہ جذبات کے ساتھ آگے بڑھا۔ اسے زندہ ہونا چاہیے اور اس کے لیے اسے دوستی سے بھر پور کلام سنانا ہوگا۔۔۔'' پھر اُسے ایک خوبصورت نظم سنا ڈالی۔۔۔ جس سے اُس کے جسمانی اعضاء پھر سے اُبھرنے لگے۔

کیا کہنے دوستی کی خوراک کے۔۔۔ اُس نے خوشی کا اظہار کیا۔

ایک لا ابالی افسانہ نگار محبت بھرے جذبات لیے آگے بڑھا۔

''اسے بالکل زندہ ہونا چاہیے اور اس کے لیے اسے ایک محبت بھرا افسانہ سُنانا ہوگا۔۔۔ پھر اُسے ایک پُر لطف افسانہ سُنا ڈالا۔ جس سے اس کی ہڈیوں کے ڈھانچے میں بھونچال سا آگیا۔ اُس کے تمام اعضاء تیزی سے بحال ہو گئے۔۔۔ اور وہ اپنے آپ کو مجتمع کر کے بیٹھ گیا۔

''محبت کی غذا کا جواب نہیں!' اُس نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے ماحول پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔

آخر میں ایک انقلابی سیاست دان مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔

''اسے عملی زندگی گزارنی چاہیے اور اس کے لئے اسے علم وفکر کے ہتھیاروں سے لیس ہونا ہوگا۔۔۔ پھر اُس نے ایک پُر جوش اور پُر مغز تقریر کی۔ جس سے اُس میں شعور وآگہی پیدا ہوئی وہ پُر وقار انداز میں اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اور پُر عزم لہجے میں کہے گا:

"مجھے اپنے حقوق چاہئیں۔۔۔ اور میں یہ حقوق مانگوں گا نہیں، بلکہ چھین لوں گا۔۔۔ کیونکہ مجھے اپنی پانچ سو سالہ محرومیوں کی مکمل تلافی کروانی ہے۔''

انسان چکا خودغرض انت

ڈاکٹر فضل خالق

اے و مئے ہر وہد یکیں کارے ات کہ ہر دیں من چہ لوگ ءَ دیم پہ کارءِ جاگہ ءَ شُتاں گڑا ہمے دراج بُرّ یں سفرءِ، نیام ءَ نیمروچ ءَ گپتگ ات ءَ انچو چہ کارءِ جاگہ ءَ دوسے ماہاں رند پہ لوگ ءِ روُگ ءَ اوماناں زرتگ ات، گڈا ہم نیمروچ ءَ ماوتی گُرشن ءِ بُگ ءَ راوتی مہربانیں دوست گورا بوتگ ءَ آنکیں مردءِ پیشانی پہ مئے سبار گے، کدی ہم کِر چک نہ بوت ءَ ماچواُشترءَ گزءِ بیتگ کدی اوں پُشت نہ دات۔

پدا یک روچے ءِ گپ انت، ماوہدے ہمے لوگ ءِ دروازگ ٹک ات ءَ مارا دست گرگ بوت گڈا ما یک سکیں کسانیں آسکلے دیست کہ وتی پادئے داشت نہ کُت انت ءَ مئے ہمے مہربانیں واجہ کار ہمیشی ءَ رابوتل ءِ سرا شہر میچینگ ءَ ات۔ ما اے ندارہ ہم وتی یادانی گرنج ءَ مان کپتگ۔ آ واجہ چرے کارءَ کہ یک گور بوت گڈا گوں ما مجلس ءِ وہداں حال ءَ احوالی بوت۔ وڑ وڑیں جاورانی بابت ءَ گپ ءَ ہبر بوت۔ سیاست اور مسم ہم گیر آرگ بوت انت۔ آئی ہمے آسکل ءِ رسگ ءِ ہال اوں دات کہ چون ءَ گُجا۔۔۔ رندءَ ما فرمائش کت کہ واجہ انوں بتکوءِ موسم انت، شگام ءَ رگام بوتیں شرات۔ من ءَ پدا پہک ءَ بہمتاں کہ آئی دپ ءَ پر ءَ درائینت۔

”تو وَیارو انند ہیں مردمے ئے، بازیں مردمے ترا راج ءِ چّم ءَ پونز سرپد بیت۔۔۔تو ہم۔۔اے مرگ ودگہ ساہدار مئے لدو جنگلانی قدرت ءِ بکشگیں زیب ءَ براہ انت۔ ماوتی بیلے، دوبیل ئے وش نگی ءَ ایشاں شکار مہ کنئیں۔ اے کہ گار بنت گڈا براہ ءَ جلوہ بَیلواہ بیت و قدرت ہم ہژم گیپت۔“

واجہ ءِ گپاں من ءَ باز اثر کُت۔ ساری ءَ برے برے من گوں سنگتاں شکارے ءِ واستا یک ءَ دروشپ ءَ روچانی قربانی داتگ ات بلے چہ ہمے واذءَ ہمے نگدیں رسالتانی اُشکنگ ءَ رند منی بالادءِ اندری کُنٹ ژامبلتگ ءَ من چہ شکارءَ یک پیمے توبہ کار بوتاں وت کدی نہ شُتاں ءَ اگاں کسے ءَ منی دیم ءَ انچیں درشانے بہ کتیں گڈا من مکن کتگ ات۔ ہئو، دل ءَ کہ برے برے ھُل کتگ ات گڈا گوں دوست نزیکیں مردماں ماہیگ ءِ گرگ ءَ شتگ اتاں، اے پیم ءَ سوک پرئتگ ات۔

اَنچو اَنچو وہد گوزاں بوت ءَ مئے ہمادودو، سے سے ماہی سفر برجاہ ات۔ ہما لوگ ءَ ہما پیہم ءَ ہم مارا پہ سبارگ ءَ ہر وہدءَ وٹس اتک کت۔ اے نیام ءَ آسکل رُدان ات، مژن بوہان ات ءَ گوں لوگ ءِ، مردماں شری شری ءَ ہوار کپتگ ات۔ نوں ہر کدی کہ مہمانانی بان پچ بوتگ ات ءَ مردم اتلگ ات گڈا آئی وت ءَ راہموداسر کتگ ات۔ آئی مہمان ءَ راوتی سرءِ سرا لگاشت بزاں چر آئی ٹیکی یے لوٹ اِت۔ بازیں مہمان کہ سرپد نہ اتاں گڈا ایشی ءَ راگلینت اِش، چم اش پیش داشت یا تیلانک اش دات۔ گڈا اے غریب بزگ بزگ ءَ شتگ ات ءَ یک کِرّ ءَ اوشتاتگ ات۔ لوگ واہندءَ آرا چاکلیٹ ءَ سگریٹے داتگ ات۔ آئی وارتگ ات ءَ پداشتگ ات۔

رند ترا ہر دیں کہ مئے سر ہمے لوگ ءَ کپت گڑا ما سگریٹ ءَ چاکلیٹ آوُرتگ ات گوں چیا کہ کدی ہم وہدے آ مئے کِرّ ءَ بئیت گڈا آئی تماہ پورا بہ بیت۔ منی گاڑی ءَ چاکلیٹ ءَ سگریٹ مان ات ہر وہدءَ پر آئی ھاترا، چیا کہ برے برے پہ ناگتی ہم پہ سُارگ ءَ ما دارستگ اتیں۔

وہد ءِ بالی ءَ بازیں پند بُرّ ئتگ ات و آسکل ءَ ہم ٹیلوئے گورا دیگ بوتگ ات۔ نوں چہے ٹیلو ءِ توارءَ زانگ بوت کہ آ کُجا انت۔ ٹیلوءَ مئے چم اے کُنڈ ءَ آ کُنڈ ءَ ودار یگ بوتاں کہ گندگ بہ بیت۔ بلے آسکل ما نہ دیست۔ کیسگ ءِ سگریٹ ءَ چاکلیٹ گشے من ءَ چُونڈُک یا چگ ءَ اشنت۔

منی ودار بس ودارے ات۔ ما آ نہ دیست۔ مارا سبارگ دیگ بوت ءَ پہ دار آ یگ ءَ سر گپتیں گڈا واجہ کارءَ مارا تاں دروازگ ءَ راہ دات بلے من انچو مارگ ءَ اتاں کہ من چیزے گار کتگ۔ دپ نہ اوشتات، جستوں کت: اے آسکل مرچی درا نہ بوت؟!“

”یار، بس نامہ کِر، یکرو چے باریں چون؟ دروازگ ءِ دپ کمے پچ بیت، ہمسائگانی کُچکے ہمے نزیک ءَ بیت، آ پر آئی وکیت۔۔۔اے ترانچ بندیت چہ دروازگ ءَ درکئیت۔ یکے کُچک آئی دُمب ءَ کپتگ ءَ پدا ٹیلو ءِ توار۔۔۔ آ بُنی وکشیگری آرا دُور بارت۔ آ باز دُور جنگل ءَ رُوت ءَ من گوں وتی سواری ءَ آئی دُمب ءَ کہ بلکیں آ منی ءَ گوش داریت۔۔۔ بلے نہ، آئی وکشی گِری (حیوانیت) ءَ جاہ جتگ ات۔ آ پہ من ہم نہ جلّ اِت۔ من آخر کہ چم ءِ سیاسی ءَ آرا تیرے پر داشت۔ آ کپت۔ من آئی جون زرت ءَ لوگ ءَ اتکوں“۔

”گُڈا؟“

”آئی گوشت نہ کہ من وارت کت ءَ نہ منی چکّاں۔ منی کستریں چُکّ انگت ہم گوں من زہر انت۔ گپّ ہم نہ جنت، آئی دوروچاں نان نہ وارتگ“۔

من اجازت کت۔ گاڑی ءَ سوار بوتاں دیم پہ وتی منزل ءَ دل ءَ سک بژن اتاں۔ سراَنچو گران ات گشے ھیر وپاں مان رُپتگ۔ دل ءَ گشتوں، نوں اے لوگ ءِ کُڈن ءَ جناں۔۔۔ حیرڑان اتاں کہ انسان چتکا خودغرض انت، ہمنکا خودغرض، ہمنکا خودغرض ۔۔۔ کہ گشیت۔

”چیزے اگاں منی نہ بیت، گڈا کسی مہ بیت۔ وتی جندءِ ہم مہ بیت“

جاپانی املوک

پی یوآن لی / عقیلہ منصور جدون

اپریل شروع ہوا——-

اپریل ختم ہوا۔مئی اور جون سب ایک قطرہ پانی برسے بغیر گزر گئے۔ بہار سے اب تک آسمان نیلے صحرا کی مانند ہے۔ ہر صبح سورج کسی چمکدار سفید طشتری کی طرح طلوع ہوتا ہے، جو دن گزرنے کے ساتھ بڑھتی اور گرم تر ہوتی جاتی ہے۔ جھینگر بددلی سے درختوں کے درمیان رینگتے ہیں۔گاؤں سے باہر ذخیرہ آب سکڑ کر لڑکوں کے لیے نہانے کا ٹب بن چکا ہے۔ کمر تک آتے پانی میں ایک دوسرے پر پیشاب کرتے رہتے ہیں۔ چار یا پانچ سال کی دو لڑکیاں سڑک کے کنارے کھڑی اپنے ننگے بازو پرندوں کے بچوں کے نازک پروں کی طرح ساکت ہوا میں ہلاتی ہوئی گا رہی ہیں۔

آؤ مشرق کی ہوا
آؤ مغرب کی ہوا
آؤ مشرق ، مغرب ،شمال ،جنوب کی ہواؤں
آؤ مجھے ٹھنڈک پہنچاؤ

اور جولائی چند دنوں کے فاصلے پر ہے۔اب ہم نے بارش برسنے کی بجائے بارش نہ ہونے کی دعائیں شروع کر دی ہیں۔تا کہ کٹائی کے موسم کے آخر تک اسی طرح خشک سالی ہی رہے۔ہم کسان ہیں۔بغیر دانوں کے موسم خزاں کے لئے پریشان ہیں۔خشک سالی ہماری زندگیوں میں پھیکا سا اطمینان لائی ہے۔ روزانہ صبح سے شام تک ہم پگوڈا (پھلی دار چینی درخت) درخت کے نیچے بیٹھے تمباکو نوشی کرتے رہتے ہیں۔اور جب تک درخت کا سایہ ہمیں مکمل طور پر سورج کے رحم وکرم پر چھوڑ دینے کی دھمکی نہیں دیتا ہم وہاں سے نہیں ہٹتے۔ گھر میں ہماری عورتیں ہمارے لئے اچھا کھانا مہیا کرنے کے لئے سر کھرچتی رہتی ہیں۔پچھلے سال کے چاول بس اب ختم ہونے کو ہیں۔اس سے پہلے ہی ہماری عورتیں بہت زیادہ بال کھرچنے سے پتلے ہو کر گنجی ہو جائیں گی۔لیکن ان سب کے لئے جیسے کہ دنیا بھر میں چھوٹے موٹے حادثات ہوتے رہتے ہیں ہم نے پریشان ہونا چھوڑ دیا ہے۔ہم بس بیٹھے سگریٹ پھونکتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ہمارا اس دن کے تمباکو کا کوٹہ ختم ہو جاتا ہے۔ہم گھاس کی جڑوں اور آدھ مردہ پتوں سے اپنے تھیلے بھر لیتے ہیں،اور جب وہ بھی ختم ہو جاتے تو ہم تمباکو کی جگہ مٹی جلانے لگتے۔ بہت دیر تک خاموش سموکنگ کے بعد ہم میں سے ایک نے بات شروع کی۔

''یہ خشک سالی قدرت کی طرف سے سزا ہے۔''

''بلکل اتنی زیادہ اموات''

''ایسی بات ہے تو قدرت ہم سے کبھی بھی خوش نہیں ہو گی۔لوگ تو مرتے ہی رہتے ہے۔''

''اور ہمیں کبھی بارش نصیب نہیں ہو گی، میرے لئے یہ سب بہت بہتر ہے۔ میں ویسے بھی کھیتی باڑی سے تنگ آ چکا ہوں۔''

''بلکل درست،قدرت تمہیں چوتڑوں پر مارنا چاہتی ہے اور تم انہیں ننگا کرنے کے لئے جلدی کرتے ہوئے کہتے ہو، آؤ مجھے یہاں خارش کر دو۔''

'' اسے کہتے ہیں رجائیت ،رونے دھونے اور معافیاں مانگنے سے تو یہ بہتر ہے۔''

''تم تو ایک نرم جاپانی پھل/ املوک ہو ،لیکن میں اس کی پینٹ پکڑ لوں گا اور اس کے چوتڑوں پر جواباً ''ماروں گا۔''

''واؤ،ایک ہیرو ہمارے درمیان۔''

''کیوں نہیں؟''

'' کیوں کہ ہم پیدائشی نرم املوک ہیں۔دیکھو ،نرم املوک سے ایک ہیرو برآمد ہوتے ہوئے۔''

''لاوڈا''

''لاوڈا،انہوں نے تربوز کی طرح اس کا دماغ بھک سے اڑا دیا۔'' وہ ہم میں سے ایک تھا۔وہ اس وقت ہمارے درمیان بیٹھا ہونا چاہیے تھا۔ ہمارے ساتھ سموکنگ کرتے ہوئے،ایک دو فقرے بولنے کے لئے اپنی باری کا انتظار کرتے ہوئے ،یا تو ہمارے ساتھ متفق یا ہم سے اختلاف کرتے ہوئے ،رات پڑنے پر ہم سب کے ساتھ گھر جاتا ،اپنے بیٹے کو پیار کرتا ،چاول کی شراب کے قطرے اپنے کانٹے سے لڑکے کے منہ میں ٹپکاتا۔ لاوڈا نے کبھی بھی ہیرو بننے کی شیخیاں نہیں بگھاری تھیں۔وہ زمین و آسمان کے درمیان اپنا مقام پہچانتا تھا۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ خشک سالی شروع ہونے سے پہلے ہی اسے پھانسی دے دی گئی۔ نئے سال کی شام وہ کاؤنٹی کے صدر مقام پر گیا اور وہاں سترہ لوگوں کو ان کے اپنے اپنے گھروں میں گولیوں سے بھون ڈالا۔ جن میں چودہ مرد اور تین عورتیں تھیں۔ان میں سے سولہ موقعہ پر ہلاک ہو گئے۔اور سترھواں صرف نئے سال کا آدھا دن دیکھنے تک زندہ رہا۔

'' اگر تم نرم املوک پیدا ہوئے تھے تو بہتر ہے،تم ایسے ہی رہو۔'' ہم میں سے کسی نے قدیم کہاوت دہرائی۔

'' املوک پیدا ہوتے وقت نرم نہیں ہوتے۔''

''لیکن ان کی افادیت ان کی نرمی میں ہی ہے۔''

''ان کے رس بھرے ہونے کی وجہ سے''۔

''اگر ہم نرم اور رس سے بھرے رہیں تو؟''

'' تو قدرت ہمیں نچوڑتی رہے گی

،یہاں تک کہ وہ نچوڑ نے سے خود ہی تھک جائے۔''

''ہوسکتا ہے وہ ہمیں پسند کرنے لگے ،ہم اس کے لئے اچھی خاصی تفریح ہیں۔''

''تب تک ہماری جلد ہمیں چھوڑ چکی ہو گی۔''

''جلد کے بغیر رہنا بھی اچھا ہی ہے۔''

''اس سے بہتر ہے ،کوئی گولی تمہارا دماغ بھک سے اڑا دے۔''

''اچھا ہے کہ تمہارا نام ونسب چلانے کے لئے کوئی بیٹا نہ ہو۔''ایک لمحے کے لئے خاموشی چھا گئی۔سب کو اپنے زندہ ہونے کا احساس ہوا۔ہم سب کے خاندانوں کو آگے بڑھانے کے لئے لڑکے ہیں۔پچھلے سال لاوڈا کا بیٹا بھی انہی لڑکوں میں سے تھا۔پانچ سال اس کی عمر تھی۔تمام چھوٹے بچوں کی طرح بڑے بچوں کے پیچھے بھاگتا ،بڑے لڑکے جب اپنی غلیل سے جھینگر مارتے تو باقی چھوٹے بچوں کے ساتھ وہ بھی مردہ جھینگر جمع کرتا جاتا۔سوکھے پتے اور خشک ٹہنیاں اس آگ میں ڈالتا رہتا جو ان جھینگروں کو بھوننے کے لئے جلائی گئی تھی۔اور ایک یا دو جھینگر جو اس کے حصے میں آتے ،ان کے لئے انتظار کرتا۔

''بہت برا ہوا جو لاوڈا کا بیٹا مر گیا''۔

''ایسے کہہ رہے ہو جیسے مرنے کا کوئی اچھا طریقہ بھی ہے۔''

''اور وہ سترہ؟''

''شہر والے کہتے تھے،وہ سترہ لوگ بری طرح مارے گئے۔''

''بہیمانہ قتل،کیا اخباروں کی شہہ سرخیاں یہی نہیں تھیں؟''

''وہ تو ہے،وہ قتل کیے گئے''

''لیکن شہر میں کوئی نہیں کہتا کہ لڑکا بری طرح مارا گیا۔وہاں تو کوئی لاوڈا کے لڑکے کا نام بھی نہیں لیتا۔''

''بے شک ، وہ کیوں لیں گے؟ کوئی بھلا قاتل کے بیٹے کے بارے میں کیوں کچھ سنے گا؟ایک مردہ بیٹا نا قابل ذکر۔''

''اگر وہ اس کے بارے میں لکھتے بھی تو کیا لکھتے؟ یہی نا کہ تیراکی کے دوران ڈوب گیا۔ یہی موت کے سرٹیفکیٹ میں لکھا گیا۔''

''ایک حادثہ ،ایسے حادثے آئے روز ہوتے رہتے ہیں۔لڑکے کی موت کوئی کہانی نہیں بنتی۔سترہ مرد وعورتوں کا قتل ، یہ کہانی بنتی ہے۔اور لاوڈا کے مقدمے میں یہی کہانی بہ آواز بلند پڑھ کر سنائی گئی۔ ان سترہ مقتولوں کی بڑی بڑی تصویریں تھیٹر کے سٹیج سے ہمیں دیکھ رہی تھیں۔اس تھیٹر کے سٹیج کو وقتی طور پر عدالت بنایا گیا تھا۔تاکہ لوگ کے لئے گنجائش بن سکے۔ہمیں تو ان کے نام بھی یاد نہیں۔لیکن کچھ چہرے جن میں سے ایک عورت گہرے بھاری میک اپ کی وجہ سے لڑکی نظر آتی تھی۔ایک آدمی جس کی آنکھوں کے آبروسنڈی نما تھے۔ایک اور آدمی جس کی بائیں آنکھ کے نیچے ایک منحوس تل تھا۔یہ چہرے تب سے ہمارے حواسوں پر چھائے ہیں۔کچھ کے چہرے تو یاد نہیں لیکن ان کی کہانیاں یاد ہیں۔ایک آدمی جو بیس سال برف کا تیراک رہا۔بلوغت کے بعد ایک دن بھی بیمار نہیں ہوا تھا۔ایک ماں جس کی نو عمر لڑکی اسی سال کے شروع میں خون کے سرطان سے مر گئی۔اور ایک سرکاری افسر اور اس کی جوان سیکریٹری جن کے بارے میں افواہوں سے پتہ چلا کے ان کا معاشقہ چل رہا تھا لیکن احاطہ عدالت میں ان کی کہانی میں انہیں محبت کرنے والے میاں بیوی بتایا گیا تھا۔اسی طرح بقایا لوگوں کی کہانیاں جنہیں سنتے سنتے ہم اونگھنے لگے تھے۔آخر ان لوگوں کی کہانیاں سنانے کا کیا مقصد تھا؟۔لاوڈا کے بھاگنے کا کوئی امکان نہیں تھا کیوں کہ اس نے یہ جانتے ہوئے کہ اسے سزائے موت دی جائے گی خود کو پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔تو بہتر نہیں تھا کہ ان کے لواحقین کو عدالت میں رونے دھونے کی شرمندگی سے بچا لیا جاتا۔اس کے علاوہ لاوڈا کی کہانی تو سنائی ہی نہیں گئی۔اس کے بارے میں صرف اتنا بتایا گیا کہ وہ سفاک مجرم تھا۔

'' اس حوالے سے سوچو ،لاوڈا ہی وہ واحد شخص تھا جو اچھی موت مرا۔''

''ایک قابل تحسین موت۔''

''اگلے جہان کے لئے اسے کافی ساتھی مل گئے۔''

''لیکن ہمیں بھی مصیبت میں ڈال گیا۔ ''

''یہ اس کی غلطی نہیں ہے ،بس قدرت ہمیں نچوڑ نے کا کوئی اور بہانہ ڈھونڈ لیتی۔''

'' بے شک ، لاوڈا تو محض ایک بہانہ بنا۔''

''میں سوچ رہا ہوں ، ہوسکتا ہے قدرت اس کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے لئے ناراض ہو؟۔''

''میں نے اپنے دادا سے اور اس نے اپنے دادا سے سنا تھا ،کہ ایک عورت کو بطور قاتلہ قتل کیا گیا تھا اور پھر تین سال تک بارش کا ایک قطرہ تک نہیں گرا۔''

''میں نے بھی اپنے دادا سے سنا تھا کہ قدرت اس عورت کا انتقام لے رہی تھی۔اس پر ظلم کیا گیا تھا۔اس نے اپنے خاوند کا قتل نہیں کیا تھا۔''

''بلکل درست''

'' لیکن لاوڈا پر ظلم نہیں ہوا۔اس نے سترہ لوگ مارے۔اسے اپنی زندگی سے ان کی قیمت چکانی تھی۔خود لاوڈا نے بھی تسلیم کیا تھا۔جب جج نے سزا سنائی تھی تو وہ جج کے آگے تعظیماً جھکا تھا۔اور گارڈ کے آگے بھی جب اسے لے جایا جا رہا تھا۔'' میں ایک قدم پہلے جا رہا ہوں''۔ اس نے کہا تھا۔''دوسری دنیا میں آپ کا انتظار کروں گا''۔گارڈز جج اور افسران جو سٹیج پر تھے سب لاوڈا سے آنکھیں نہیں ملا رہے تھے۔لیکن وہ الوداع کہنے میں ثابت قدم رہا۔'' جلد آنا مجھے بہت زیادہ انتظار مت کروانا۔''

ہمیں لاوڈا سے اس حس مزاح کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ہم اسے دیکھ کر مسکرائے۔وہ ہمیں دیکھ کر مسکرایا۔لیکن فوراً''ہی جج نے دو اور گارڈز کو اشارہ کیا کہ قبل اس کے وہ مزید بلاوے دے اسے سٹیج کے پیچھے لے جائیں۔

''لاوڈا مر دتھا''۔

''اسے قدرت نے مارا''

''لیکن اب بالادستی کس کی ہے۔؟''

'' یہ سب اب لاوڈا کے لئے بیکار ہے۔''

''وہ اپنے بہترین لمحات جی گیا''۔

''لیکن یہ ہمارے لئے اہم ہے''۔

''ہمیں ان کے لئے سزا مل رہی ہے جن کے ساتھ ظلم ہوا''

''کون؟''

''وہ سترہ۔''

''اس بھڑوے کی بیوی تو نہیں''

''بلکل نہیں وہ تو مستحق تھی''۔

'' وہ عورت لاوڈا کی بیوی کے انگوٹھے کے ناخن سے بھی چھوٹی تھی۔''

''لاوڈا کی بیوی بہت اچھی عورت تھی۔''

سب نے اس بات کی تائید کی اور دل ہی دل میں اپنی بیویوں کا اس سے مقابلہ کرنے لگے۔ وہ کھیتوں میں مردوں کی طرح کام کرتی تھی اور گھر میں عورت بن کر رہتی تھی۔ وہ گول مٹول صحت مند تھی۔ جب لاوڈا اسے درست یا غلط وجہ سے یا بغیر وجہ کے مارتا تو کبھی آواز نہ نکالتی۔ ہماری بیویاں اتنی مکمل نہیں ہیں۔ اگر وہ بہت پتلی نہیں ہیں تو پھر بہت موٹی ہیں۔ اگر وہ محنتی ہیں تو ہمیں کبھی اکیلا نہیں چھوڑتیں۔ ہر وقت ہمیں ہماری سستی کے طعنے دیتی رہتی ہیں۔ مار کھانے پر واویلا کرتی ہیں۔ بلکہ اس سے بھی بدتر، بعض دفعہ تو مڑ کر ہاتھا پائی کرتی ہیں۔

''اتنی اچھی عورت کی قسمت اچھی ہونی چاہیے تھی۔''

''ایک اور بیٹے کی مستحق تھی۔''

''لیکن اس کی ٹیوبز تو باندھی جا چکی تھیں

''

'' غریب عورت مزید زندہ رہتی، اگر پیدائش کنٹرول دفتر۔۔۔۔۔۔۔

''وہ بدمعاش لفنگے۔۔۔۔۔

پیدائش کنٹرول دفتر کافی عرصے سے لاوڈا اور اس کی بیوی کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے لاوڈا کے گھر پر بڑے بڑے سرخ برش سے ''ایک بچہ ایک خاندان'' لکھ دیا تھا۔ انہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ صرف سور اور کتے ایک سے زیادہ بچے پیدا کرتے ہیں۔ لیکن لاوڈا اور اس کی بیوی نے کبھی ہار نہ مانی۔ وہ پیدائش کنٹرول دفتر کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے رہے۔ جب کبھی بیوی کا پیٹ بڑھ جاتا تو وہ کسی نہ کسی رشتہ دار کے گھر چھپ جاتے۔ تین بیٹیوں کی پیدائش اور ہر دفعہ کے جرمانے سے بننے والے قرضے کے بعد آخر کار ان کا بیٹا پیدا ہوا۔ جس دن لڑکا سو دن کا ہوا تو لاوڈا نے ایک بکری اور دو دودھ پیتے سور ضیافت کے لئے ذبح کئے۔ اس کے بعد بیوی کو فاتحانہ انداز میں کلینک ٹیوبیں بندھوانے کے لئے بھیج دیا۔

''جینے کا کیا فائدہ اگر وہ لاوڈا کو ایک اور بیٹا نہیں دے سکتی۔ مرغی انڈے نہ دے تو وہ کس کام کی۔'' صحیح''

''لیکن وہ عورت وہ خاص چیز تھی۔''

''کیا نہیں تھی؟''

ہم نے خوف اور حیرانی کے ملے جلے تاثرات سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ یہ سب جانتے ہوئے کہ ہماری عورتیں کبھی اتنی جرات نہیں کر سکتیں۔ جتنی لاوڈا کی بیوی نے کی۔ ہماری عورتیں چیختی چلاتی اور بھیک مانگتیں، جب ہمارے پاس ان کے بڑھے پیٹ کا علاج طلاق کے علاوہ کچھ نہ ہوتا۔ لیکن لاوڈا کی بیوی نے کبھی بھی عام عورتوں جیسا برتاؤ نہیں کیا۔ جب ہم سب لاوڈا کے ساتھ اس کے بچے کی لاش کے لئے ذخیرہ آب کو کنگھال رہے تھے۔ تو اس کی بیوی کیڑے مار ادویات کی چھ بوتلیں جو اس کے ہاتھ لگیں، ایک ہی وقت میں پی گئی۔ چھ بوتلیں ایک ساتھ اس کو اندر سے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لئے بہت زیادہ تھیں۔ لیکن چپ چاپ بستر پر لیٹ گئی۔ کوئی آواز نہ نکالی۔ جبڑے بھینچ لیے اور موت کا انتظار کرنے لگی۔

''انتہائی غیر معمولی عورت''

'' ہو سکتا ہے قدرت اسی کے لئے ناراض ہو۔''

'' لیکن اس کے ساتھ کسی نے بھی زیادتی نہیں کی تھی۔''

''ہاں، لیکن اس کی روح مایوس ہو چکی تھی۔''

''کس سے؟''

''لاوڈا''

''لاوڈا نے تو اس کا اور اپنے بیٹے کا انتقام لیا۔''

''کیا وہ یہی چاہتی تھی؟''

''سنو، وہ لاوڈا کی نئی بیوی کے لئے جگہ خالی کر رہی تھی۔ تاکہ لاوڈا کے مزید بچے ہو سکیں۔ اس نے زہر اس لئے نہیں پیا تھا کہ لاوڈا کا دماغ خراب ہو جائے۔ اور ایسا بیوقوفانہ فیصلہ کر لے۔ سترہ لوگوں کو گولی مار دے۔ سوچو! ذرا لاوڈا نے سب کچھ غلط کر دیا۔''

''اس کی موت زیادہ فائدہ مند ہو سکتی تھی۔''

''یہ سچ ہے''

''اب تو اس کی موت رائیگاں گئی۔''

''اور لاوڈا بھی''۔

''اور وہ سترہ بھی''

''اور تین بچیاں بھی بلاوجہ یتیم ہو گئیں۔''

ہم نے تینوں لڑکیوں کے بارے میں سوچتے ہوئے سر ہلائے۔ ان کی چیخ و پکار سے ہمارے کانوں کے پردے پھٹ رہے تھے۔ جب کاؤنٹی افسران انہیں بازوؤں سے پکڑ کر زبردستی جیپ میں ڈال رہے تھے۔ انہیں تین مختلف کاؤنٹیز میں علیحدہ علیحدہ بھیج دیا گیا۔ سفاک قاتل کا گندہ تخم۔ لاوڈا کو اسی وقت جب وہ پیدا ہوئی تھیں تو ہماری بات مان لینی چاہیے تھی۔ انہیں اسی وقت ڈبو دیتا تو آج وہ زندگی بھر اذیت سہنے سے بچ جاتیں۔

''لاوڈا کچھ بہتر کر سکتا تھا۔''

''لاپروا آدمی''

''ہم لاوڈا سے بہتر انتخاب کرنے کے اہل تھے۔ ہم مردے کو دفن کرتے۔ نئی بیوی ڈھونڈتے اور نیا بیٹا پیدا کرتے۔ بیوی بچوں کو کھلانے کے لئے کام کرتے کرتے ہماری کمریں دھری ہو گئی ہیں۔ نرم املوک ہونے کے ذلت آمیز احساس پر درد ہونا قدرتی بات ہے۔ لیکن تذلیل سے بندہ مرتا نہیں، زندگی سے کچھ بھی چمٹا ہوا نہیں۔ موت ہمیں کہیں نہیں جانے دیتی۔

''ایک انسان کی غلطی انسانوں سے بھرے جہاز کو ڈبو دیتی ہے۔''

''صحیح''

''بیٹے کی موت زندگی کا سب سے بڑا سانحہ نہیں ہے''

''کسی کی بھی موت دماغ الٹنے کا بہانہ نہیں بننا چاہیے۔''

''لیکن لاوڈا کا اپنے بیٹے کے لئے انصاف کا تقاضہ کرنا اس کا حق تھا۔''

''انصاف، کیا ہمارے لئے کسی قسم کا انصاف ہے؟۔''

''جب کوئی قتل کرتا ہے تو اسے اپنی زندگی سے اس کی قیمت چکانی پڑتی ہے۔اس قدیم اصول میں کچھ بھی غلط نہیں ہے۔تو پھر جس نے لاوڈا کے بیٹے کو قتل کیا،تو اسے بھی تو سزا ملنی چاہیے تھی۔''

''اسے سزا ملی،سب سے پہلے لاوڈا نے جسے گولی ماری،کیا وہ بچے کا قاتل نہیں تھا؟۔''

''دو گولیاں دماغ میں، دو گولیاں دل میں۔''

''اس کی بیوی کے سامنے۔''

''بہت اچھا کیا۔''

''اس سے بہتر کیا ہوسکتا تھا۔''

''جب میں نے سنا،تو مجھے لگا میں نے جوار کی شراب کا بھرا برتن حلق سے نیچے اتارا ہو۔ یہ یہاں کی بہترین شراب کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔''

''یہ ہوا نا انصاف''

''درست''

''کوئی بھی انصاف کے شکنجے سے نہیں بچ سکتا۔بس صرف وقت کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔''

''قدرت، دیکھتی ہے، کیا ایسا نہیں ہے؟ ''

''اگر ایسا ہے تو پھر ہمیں کیوں سزا ملتی ہے؟ یہ کس قسم کا انصاف ہے۔''

''میں تمہیں بتا چکا ہوں،ہم املوکوں کے لئے کوئی انصاف نہیں۔''

''اگر تم ایک شخص کو قتل کرو تو تم قاتل اور اگر تم بہت ساروں کو قتل کرو تو تم ہیرو ہو''

''لاوڈا نے سترہ قتل کئے۔''

''اگر تم نے اپنی بات سمجھا لی تو تم ہیرو ،اگر نا کام رہے تو کچھ بھی نہیں''۔

''یہاں کیا سمجھانا تھا؟۔''

''ایک نظم و ضبط جو سب پر لاگو ہوتا ہے۔''

''تم ناممکنات کی بات کر رہے ہو،تم خواب دیکھتے ہو۔''

''ہم نے ہنگامے کے دوران یہ سب پوچھا تھا،لیکن ہمیں کیا ملا؟''

''وہ اس لئے کہ ہم نے ہار مان لی تھی۔''

''بکواس، مردہ لڑکے کے لئے لڑائی میں کیا سمجھانا تھا۔''

''صحیح''

ہم سب نے متفق ہوتے ہوئے سر ہلائے۔ ہم سب چھوٹا سے چھوٹا شک دور کرنا چاہتے تھے۔ جو مستقل تنگ کرنے والی مکھی کی طرح ہمیں گھیرے ہوئے تھا۔ بے شک ہم جو کر سکتے تھے ہم نے کیا۔جب لڑکے کا مردہ جسم پانی سے نکال لیا گیا تو ہم سب اسے لے کر کاؤنٹی کے دفتر گئے۔ اور انصاف کا مطالبہ کیا۔ بیلچے ، کدالیں، کلہاڑیاں اپنے مکے اور گلے سب ساتھ لے کر گئے۔لیکن جب حکومت نے مسلح پولیس دستے ہماری طرف بھیجے تو ہم نے واپس گھر آنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور لاوڈا کو سمجھایا کہ اس مسلے کا حل تشدد نہیں ہے۔ عدالت جاؤ اور اس پر مقدمہ کرو۔ قانون کے مطابق چلو۔

''شاید ہمیں لاوڈا کے دماغ میں مقدمہ بازی کا خیال نہیں ڈالنا چاہیے تھا۔''

''میں اگر اس کی جگہ ہوتا تو یہی کرتا۔''

''یہی کیا؟۔شہر جا کر اس کے بیٹے کے لئے انصاف مانگتے۔ اس کا بیٹا تیرا کی کے حادثے میں ڈوب کر مر گیا۔ سفید کاغذ پر سیاہی سے اس کی موت کی سند میں یہی لکھا تھا۔''

''لیکن ہمارے لڑکوں نے تو مختلف کہانی سنائی تھی۔''

''عدالت کہانیاں کیوں سننا پسند کرتی ہے؟''

''ہم بیٹھ کر سگریٹ پیتے ہیں اور کسی کے سوال کا جواب دینے کا انتظار کرتے ہیں۔ پانی سے بھیگے ہوئے لڑکوں کا ایک گروہ ذخیرہ آب سے واپس گاؤں لوٹ رہا ہے۔لاوڈا کا لڑکا کبھی نہ ڈوبتا اگر پچھلے سال بھی خشک سالی ہوتی۔اس سال ہمیں بچوں کی کوئی پریشانی نہیں ہے ،ان بچوں کے لئے بھی نہیں جو تیرنا نہیں جانتے۔لیکن پچھلے سال صورتحال مختلف تھی۔ پانی اتنا گہرا تھا کہ لاوڈا کا بیٹا ڈوب گیا۔

''کیا تمہارے خیال میں افسران نے غلطی نہیں کی۔؟اگر وہ لاوڈا کو کچھ رقم دے دلا کر خاموش کرا دیتے۔''

''اگر وہ اس آدمی کو ایک دو مہینوں کے لئے جیل میں ڈال دیتے۔''

''کیا یہ خیال زیادہ ہوشیاری کا نہیں کہ وہ یہ ظاہر کرتے کہ وہ آدمی جیل میں ہے۔''

''ہاں،بس لاوڈا کو بتا دیا جاتا کہ اس کو سزا دے دی گئی ہے۔''

''ہاں بس لاوڈا کے ساتھ ذرا بہتر سلوک کرتے''

''اس طرح اپنے آپ کو بچا لیتے۔''

''لیکن انہیں کیا پتہ تھا،انہوں نے سوچا تھا لاوڈا ایک نرم املوک ہے۔''

''اسے اپنی تفریح کے لئے خوب نچوڑ و۔''

''اس کے اندر سے ایک قاتل نچوڑ کر نکالو۔''

''لاوڈا وہ آخری شخص تھا جو ایسے جواب دیتا۔''

''حیران کن بات ہے انسان کتنا کچھ برداشت کرتا رہتا ہے اور پھر اچانک پھٹ پڑتا ہے۔''

''صحیح''

''لیکن واپس میرے سوال کی طرف آؤ ،ایک مردہ بیوی اور مردہ بچے کے لئے دماغ خراب کر لینے میں کیا اچھا ہے۔؟ ''

''کہنا آسان ہے کرنا مشکل ہے''

''درست''

''کتنی دفعہ ہم نے اسے سمجھایا، کہ اب وہ مقدمے کا پیچھا چھوڑ دے۔''

''صحیح''

''بعض اوقات ایک خیال انسان کے دماغ میں سما جاتا ہے اور وہ اس کے پیچھے شکاری کتا بن جاتا

ہے۔اسے صرف اپنا ہدف ہی دکھائی دیتا ہے۔''

'' اور اب ہم اس کی بیوقوفی کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔''

ہم سب نے لاوڈا کے لئے افسوس کرتے اور اپنے بارے میں افسردہ ہوتے ہوئے سر ہلائے۔لاوڈا کو ہماری بات سننی چاہیے تھی۔اس کی بجائے وہ ان افسران کے نام اور پتے اکھٹے کرتا رہا جنہوں نے اسے کتے کی طرح دھتکارا تھا۔ہمیں نہیں معلوم وہ کب سے اس قتال کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے نئے سال کی شام تک اس قتل عام کے لئے آدھا سال صبر کیا۔یہ بہترین وقت تھا۔جب تمام لوگ سال کی اختتامی ضیافت کے لئے گھروں میں موجود تھے۔

'' کم از کم ہمیں لاوڈا کو اتنا اچھا پلان ترتیب دینے پر اس کی تعریف کرنی چاہیے۔''

''جب انتقام کا وقت آیا تو اس نے بتا دیا کہ اس کے پاس دماغ ہے۔''

'' اور وہ سترہ لوگ، سوچو، جب اس رات انہوں نے لاوڈا کو دیکھا تو صدمے سے ان کی کیا حالت ہوئی ہو گی۔''

''کیا خیال ہے انہیں پچھتاوے کا وقت ملا ہوگا، اسپر جو کچھ انہوں نے لاوڈا کے ساتھ کیا۔''

'' مجھے امید ہے ان کے خاندان والے اسی طرح اس کے آگے گڑگڑائے ہوں گے جیسے لاوڈا اپنے لڑکے کے لئے ان کے آگے گڑگڑایا تھا۔''

کوئی نہیں جانتا کہ ایک نرم املوک سے کس وقت کیا توقع کی جاسکتی ہے۔''

''امید ہے انہیں سبق مل گیا ہوگا۔''

''وہ مر چکے ہیں''

''تو پھر کسی اور نے سبق سیکھا ہوگا۔''

'' خاموش !محتاط رہو، اگر کسی کاؤنٹی والے نے سن لیا تو۔۔۔''

'' اتنی گرمی میں وہ یہاں نہیں ہو سکتے۔آبی ذخیرہ اب ان کے لئے اتنا گہرا نہیں رہا۔آبی ذخیرہ ہی تمام برے واقعات کا سبب ہے۔اس محنت کا سوچو جو ہم نے اس کے لئے کی۔''

ہم سب نے ہاں میں سر ہلائے اور آہ بھری۔کچھ عرصہ قبل ہم نے اپنا سارا فارغ وقت اس کی تعمیر میں لگا دیا۔اس امید میں کہ ہمارا بارش کے لئے قدرت پر انحصار ختم ہو جائے گا۔ بہت جلد آبی ذخیرہ کاؤنٹی افسران کے لئے تفریح گاہ بن گیا۔گرمیوں کی سہہ پہروں میں وہ جیپ پر آتے ،ہمارے پانی میں تیراکی کرتے۔ہماری مچھلیاں پکڑتے۔وہ شخص ایک جج تھا،لیکن اس کا اصل کام کیا تھا ہمیں نہیں معلوم۔کیوں کہ ہم کاؤنٹی عدالت میں کام کرنے والے ہر شخص کو جج ہی کہتے تھے۔وہ جج اور اس کے ساتھی آئے ،پانی میں اترنے سے پہلے ہی وہ نشے سے مدہوش تھے۔لاوڈا کے بیٹے نے کچھ کہا،کوئی مذاق کیا ہوگا۔جس سے وہ ناراض ہوگیا۔اس نے لاوڈا کے بیٹے کو اٹھایا اور گہرے پانی میں پھینک دیا۔ ایک بڑا جھپا کا،لڑکوں کو یاد رہا۔وہ چیخے اس کی منتیں کیں۔لیکن جج نے کہا وہ اسے سبق سکھائے گا۔لڑکوں نے اپنے میں سے تیز ترین کو مدد لینے بھیجا۔لاوڈا کا بیٹا اس رات دیر سے ملا۔اس کی آنکھیں ،ہونٹ،انگلیاں ،انگوٹھے الغرض سب کچھ مچھلیوں نے کھا لیا تھا۔

'' یاد ہے لاوڈا ان میں سے تھا جو یہ ذخیرہ بنانے میں سب سے آگے تھے۔ اس نے کام کر کر کے اپنی کمر دھری کر لی تھی۔''

''بے چارہ نہیں جانتا تھا، کہ وہ کس لئے اپنا پسینہ بہا رہا تھا۔''

''ہم میں سے کوئی نہیں جانتا تھا۔''

''چلو ہم ان گرمیوں میں تو پسینہ نہیں بہا رہے۔''

''یقیناً''،کوئی بھی موت کے انتظار میں پسینہ نہیں بہاتا''

''موت''

''نہیں ،اتنا برا نہیں ، میں پوچھتا ہوں ،اس سرما میں ہم عورتوں اور بچوں کو کیا کھلائیں گے۔؟''

''جو کچھ خزاں سے بچ جائے گا۔''

'' کچھ نہیں بچے گا۔''

'' تب اپنی گائیں اور گھوڑے کھلائیں گے۔''

''پھر''

'' پھر ہم کاؤنٹی جائیں گے اور بھکاری بن جائیں گے۔''

''بھیک مانگنا جرم ہے''

''مجھے پرواہ نہیں۔''

''اگر کچھ غیر قانونی کرنا ہی ہے تو بھکاری کیوں بنیں؟ تاکہ ہر آنے جانے والا ہم پر تھوکے، میں تو کاؤنٹی جاؤں گا اور کھانے کی درخواست کروں گا۔''

'' کیسے؟''

''اپنی کلہاڑی اور ہاتھ سے۔''

''بڑھکیں نہ مارو''۔

''ایک دفعہ پہلے بھی ہم اپنی کلہاڑیوں اور مکوں کے ساتھ گئے تھے۔''

'' لیکن وہ مردہ بچے کے لئے تھا ،اس دفعہ ہم اپنے بچوں کے لئے جائیں گے۔''

'' تمہارا خیال ہے ایسے کام بن جائے گا۔''

''کوشش تو کرنی چاہیے۔''

'' بیوقوفانہ سوچ ، اگر ایسے کام بنتا تو پچھلی دفعہ ہی بن جاتا۔لاوڈا کو کسی کو مارنے کی ضرورت نہ پڑتی۔''

''اور ہمیں سزا نہ ملتی۔''

سب خاموش ہو گئے۔ سورج آہستہ آہستہ جنوب مغربی آسمان پر پہنچ گیا۔جھینگروں کا شور بند ہو گیا۔ کچھ نے بجھے ہوئے پائپ سے تصوراتی دھواں نکالا۔دوسروں نے خشک ٹہنیاں زمین سے اٹھائیں اور گرد میں گہرے بارش سے بھرے بادلوں کی ڈرائنگ بنائی۔

بھگوان کے موالی

شاہد اقبال کامران

"اے بھگوان! میری لکھی بدل دے، تو سب کچھ کرسکتا ہے، سب تیرے ہی بس میں ہے، تو چاہے تو میرا رام لوٹ آئے، میری ماتا جی کے روگ دور ہو جائیں، میرے بھگوان تو چاہے تو ہمارے دن پھر سکتے ہیں۔"

آشا بدشکل مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑے التجا کر رہی تھی۔ بھگوان کی نمائندگی کرنے والی یہ مورتی چہرے پہ بھیانک تاثرات لئے ساکن کھڑی تھی۔آشا جب چھوٹی تھی تب اپنے دھرم سیوک باپ سے پوچھا کرتی؟ پتا جی ! یہ بھگوان اتنے ڈراؤنے سے کیوں ہوتے ہیں؟۔اس کا اشارہ کسی کریہہ المنظر مورتی کی طرف ہوتا - جواب میں اس کے پجاری پتا جی پرشاد کی کوئی میٹھی چیز اس کے منہ میں ڈال کر اوپر سے پی لے لیتے۔ "" بچے ایسی باتیں نہیں سوچتے۔چل جا باہر کھیل کود- "

اب بھی ویسی ہی مورتی آشا کے سامنے بھگوان بنی کھڑی تھی۔اسے بنانے والا بھی بڑا ہی خبیث آدمی ہوگا - بت تراشی تناسب اور حسن کا فن ہے، ایسی مسخ مورتی بنا کر اس نے بھگوان کی نہیں شیطان کی علامت تیار کی ہوگی- پر نہیں ، سارے مندروں کی مورتیاں آپس میں ملتی جلتی ہیں- شاید بھگوان ایسا ہی ڈراونا ہو؟۔آشا سوچتی تھی کہ ایسا ہو بھی سکتا ہے۔ آخر جس کے ہاتھ میں سارے جگ کی باگ دوڑ ہے، یہاں بسنے والے لوگوں کے دکھ سکھ، آبادی اور بربادی سب کچھ جس کی مرضی کے تابع ہے، وہ لوگوں کے مقدر لکھتا ہے تو اچھے لکھا کرے نا، یہ کیا بات ہوئی کہ بھگوان اچھا مصنف بھی نکلے؟ ۔وہ بگڑے بچوں کی طرح من مانیاں کرتا ہے۔وہ لوگوں کو بناتا ہے اور پھر ان کے کھیل دیکھتا ہے۔اس کو برباد کیا، وہ رویا تڑپا، بھگوان جی خوش ہو گئے۔ اس کو نہال کر دیا۔ضرورت سے زیادہ دے کر دماغ بگاڑ دیا، واہ بھگوان کی عادتیں بھی بالکل بچوں جیسی ہیں۔ہر کھلونے کو توڑ پھوڑ کر دیکھ نہ لے چین نہیں آتا۔لیکن نہیں، آشا سوچتی یہ دل لگتی بات نہیں ہے۔ بھگوان ایسا بھیانک ہرگز نہیں ہوسکتا۔انسان خود خوبصورت ہے- اندر سے پوتر پیدا کیا گیا ہے۔اس کا بنانے والا تو بہت ہی پوتر اور مہان ہوگا-تو پھر پجاری لوگ بھگوان کے لئے اچھی اچھی علامتیں تلاش کیوں نہیں کرتے ؟ آخر مندروں میں پڑی یہ بدنما مورتیاں حسن کے بنانے والے کی نمائندہ کیونکر ہوسکتی ہیں ؟ ---- "اے بھگوان میرے من کی مراد پوری کر-" ہاتھ جوڑے کھڑی آشا نے نظر اٹھا کر بھگوان کی طرف دیکھا۔ اس کا من بولا یہ بھگوان نہیں ہے- پھر من ہی نے تردید کی کہ ایسا سوچنا پاپ ہے، مہا پاپ۔بھگوان کو اس کے مقام سے گرا کر دیکھنا۔۔۔ہائے رام شما کردے۔ بڑی بھول ہوگئی۔لیکن یہ من بڑا ہی چنچل ہے۔ایک بار جو خیال اس میں سما جائے پھر نکلتا نہیں۔آشا کے من میں بھی یہ بات آن ٹکی تھی کہ بھگوان اتنا ڈراونا کیوں بنایا جاتا ہے۔اس نے بڑا سوچا اپنے پریمی رام سے بھی پوچھ لیا اس نے بتایا کہ یہ مورتیاں اصلی بھگوان نہیں ہیں- یہ بھگوان کی علامتیں ہیں- اصل بھگوان تو کہیں اور رہتا ہے۔ یہ مورتیاں ہمارا گیان دھیان اس کی طرف لے جاتی ہیں اور بس۔یہ مورتیاں مندروں میں بھگوان کی نمائندگی کرتی ہیں۔اس لئے ان کے ظاہری روپ کو نہ دیکھا کر۔بس یہ سوچ لیا کر کہ اصلی بھگوان بڑا ہی سندر ہے۔سنسار میں پھیلی ساری سندرتا اسی کی ہے۔آشا دائیں بائیں دیکھتی، ہر شے میں روپ ہی روپ نظر آتا۔ پیڑ ، پتے ، کلیاں، پھول ہر چیز سندر اور سبزے پر نیلی اوڑھنی ، اس پر اڑتے پرندے، جیسے کسی پوتر دیوی کی کڑھی ہوئی چادر ہو- کتنی ہی چیزیں ہیں جنہیں دیکھ کر تن من نہال ہو جاتا ہے-"سب ٹھیک ہے، دیکھ را موسب ٹھیک ہے- یہ پجاری لوگ بھگوان کی مورتیاں تو خوبصورت بنوایا کریں، کم از کم انہیں دیکھ کر سکون تو ملے " اپنی پریمی کا کی یہ بات سن کر رام ہنس دیتا- "تو تو پاگل ہے سر پھر گیا ہے تیرا- چل آ ، آگے چلیں" وہ دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے پہاڑیوں میں گھومتے پھرتے۔ آشا نے دعا پوری کی ، پرنام کیا، مڑنے ہی والی تھی کہ سر پر ایک بھاری ہاتھ آن پڑا -گرم اتنا کہ اوڑھنی اور گھنے بالوں کے باوجود سر کو تپا گیا۔

" بھگوان کرم کرے گا ، وہ بڑا دیالو ہے۔"

" جی " آشا سر جھکا کر کھڑی ہوگئی۔ گاؤں کے بنا پجاری اس مندر میں یہ سیوک نئے نئے آئے تھے۔ان کے آتے ہی مندر مندر لگنے لگا تھا ، یہ بڑی دیکھ ریکھ کرتے۔خود بھی بڑے پنچے ہوئے لگتے تھے. گاؤں میں یہ بات چل رہی تھی کہ نئے پجاری جی میں کوئی بات ہے ، جسے آنکھ بھر کر دیکھ لیں وہ ساکن ہو جاتا ہے . ان کے ماتھے پر لمبی تپسیا کی کہانی رقم تھی۔ پر جی جان کے اچھے تھے۔ایک چادر اوڑھ رکھی تھی ، گلے میں مالا، دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں نگینے-" کاہے کی چنتا ہے بچے؟"

"جی وہ"۔ انسان اور بھگوان کے بیچ آنے والا شیطان ہوتا ہے، آشا نے

سوچا کہ یہی بول دوں- پھر چپ رہی کہ بچاری لوگ ہماری دعاوں کو آگے دھکیلنے کا دھندہ صدیوں سے کرتے آ رہے ہیں۔ پھر وہ سوچتی کہ اسی دھکم پیل میں ہماری دعائیں بھگوان تک پہنچ نہیں پاتیں اور ہم بھگوان کا گلہ دل میں لئے برباد ہو جاتے ہیں۔ اس کا اپنا باپ پجاری تھا۔ اس لیے وہ پجاریوں کے حیلوں سے واقف تھی۔ جب وہ زندہ تھا تو آشا اسکے ساتھ بات لڑائے رکھتی۔"

اچھا پتا جی۔۔۔اب یہ کیا ہوا؟"

"تو چپکی رہ- تجھے ان دھندوں سے کیا ،یہ بندے اور بھگوان کے معاملے ہیں۔"

"یہ بھگوان کہاں سے آ گیا ؟ مجھے تو سارے چکر میں آپ ہی آپ نظر آتے ہیں۔"

دھرم کا ٹھیکیدار اسکا پتا کتنا ہی چالو پجاری کیوں نہ ہو، بیٹی کے سامنے بھیڑ بن جاتا۔ اس کی ایسی باتیں سن کر وہ بڑھتا اور ماتھے پہ پیار کرتے ہوئے بڑبڑاتا "بڑی منہ پھٹ ہے تو، بالکل اپنی ماں کی طرح باتیں کرتی ہے۔"

"میری ماں۔۔۔۔" آشا اداس ہو جاتی۔ "پتا جی میری ماں کیسی تھی۔؟" پجاری خاموش ہو جاتا اور ایسے نظریں جھکا لیتا جیسے کسی سے کی ہوئی کوئی زیادتی یاد آ جائے۔

"بہت اچھی تھی۔ بہت ہی سندر-"

"وہ مجھے پیار کرتی تھی۔؟ بتاو نا پتا جی پیار کرتی تھی؟" اس کا پتا اٹھ کر باہر نکل جاتا اور یہ اکیلی آنکھیں بند کیے ماں کا سہانا تصور قائم کرنے کی کوشش کرتی رہتی۔ اب بھی ماں کا خیال اس کی آنکھیں بھگو دیتا۔ اسے اپنے باپ کی زندگی میں ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی ان دیکھی ماں بھی ایک دکھی جیون بتا کر پرلوک سدھاری تھی۔ اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو بہہ نکلے۔

" نراش ہونا پاپ ہے، بھگوان تمہاری اچھا پوری کرے گا" پجاری کا گرم ہاتھ آشا کے سر سے پھسل کر شانوں تک آیا، اور اٹھ گیا۔ "جاؤ بچے نشچنت ہو کر جاو"

اور آشا تیز تیز قدم اٹھاتی باہر نکلی آئی-" "بڑھیا کو چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھی۔؟" آشا گھر لوٹی تو رام کی ماں آشا کی راہ دیکھ رہی تھی۔ "میں آ گئی ماں مندر گئی تھی ،تمہیں بتا کر تو گئی تھی۔" پھر منہ بنا کر بولی۔۔" بھگوان سے پھر پراتھنا کی ہے ، اس نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔اور ہاں ماں وہ جو نئے پجاری جی آئے ہیں نا۔" آشا ایک لمحے کو رک گئی۔ ہاں انہوں نے بھی دعا دی، کہنے لگے مراد پوری ہوگی"

" کن بکھیڑوں میں پڑ گئی ہو پاگل لڑکی ؟۔ تو کیا سمجھتی ہے ہمارے حالات بھگوان سے چھپے ہوئے ہیں۔ اور تیرے ہی یاد دلانے سے وہ ہم پر دیا کرے گا۔"

" نہ ماں ،میرا مطلب یہ تو نہیں ، دعا مانگنا تو۔۔۔۔"

"بیٹی" بڑھیا بولی" جس نے بگاڑا ہے وہی سنوارے گا۔۔۔اس بیچ میں ہمیں صبر کرنا چاہیے"

"سو تو ٹھیک ہے ماں پر یہ بھگوان آخر کر کیا رہا ہے، جو ہماری نہیں سنتا ، مجھے تو لگتا ہے کہ ہم لوگوں کا کوئی بھگوان ہی نہیں، بلکہ سارے دکھی لوگوں کا بھگوان ہے ہی نہیں۔۔۔یا اگر تھا بھی تو اب مر گیا ہے۔"

" کیا اول فول بکنا شروع کر دیا تو نے۔ زبان بڑی لمبی ہے تیری"

"اور کیا" آشا کا رنگ غصے سے زرد ہو گیا۔ " بنا بھگوان کے یہ جگ انات آشرم ہے ماں۔ اور اسکا سارا نظام غنڈے موالی لوگ چلا رہے ہیں، کوئی انہیں سادھو سنت کہتا ہے تو کوئی پروہت پجاری-"

"سیدھی نرک میں جائے گی تو۔ ہاں سن لے تو"

بڑھیا کھانسی دار آواز میں چلائی۔ " ہوں نرک" آشا بڑبڑائی- پھر بولی" اچھا ماں تو اب آرام کر۔ کتنی بار کہا ہے کہ کھاٹ سے مت اترا کر۔ جب سارے کام کاج میں کر لیتی ہیں تو، تو ،ارے باپ رے بھول گئی ،وید جی کے پاس جانا تھا تمہاری دوا لینے"۔

رام کی بوڑھی ماں اپنے بیٹے کے گم ہوتے ہی گھاٹ سے آن لگی تھی۔ اور تب سے حالت خراب تھی۔ جوان جہاں بیٹا کھو جائے تو ماں کب پوری رہتی ہے، ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔ اور پھر جس کا ایک ہی سہارا ہو وہ نیچے نہیں گرے گی تو کہاں جائے گی۔ رام کھو گیا ، اب تک لاپتہ ہے۔ اس بیچ میں آشا نے بڑھیا کی جو سیوا کی وہ کوئی سگی بھی ہوتی تو نہ کر پاتی۔ پہلے جب رام موجود تھا تو بڑھیا آشا کے نام تک سے جلتی تھی۔ وہ اپنے بیٹے سے کہتی کہ پجاری کی چڑیل بیٹی سے دور رہا کر وہ تو بڑی چالاک ہے۔" ہر ماں کو اپنا بیٹا بھولا بھالا معصوم اور اسکے مقابلے کی لڑکی چالباز جادوگرنی نظر آتی ہے۔ پر رام ساتھ کا پکا تھا۔ اسے چھوڑ نہ سکا۔ دونوں کا لگن بھی ہو جاتا۔ لیکن پھر وہ لاپتہ ہو گیا۔ بڑھیا بھی اکیلی ہو گئی ، اور آشا بھی۔ جو باپ کے مرنے کے بعد تنہا زندگی گزار رہی تھی۔ جوانی میں رام سے سانجھ بندھی ، پر سانجھی ہی کھو گیا۔۔۔ہٹ کتنی کھراب قسمت ہے تیری" آشنا خود سے کہا کرتی۔ " ہاں ماں جی میں وید جی کے پاس جا رہی ہوں ،ابھی آجاوں گی-" آشنا گھر سے نکلی۔ سوچنے لگی آج وید جی سے لڑائی ہو جائے گی اتنا عرصہ ہو گیا دوا استعمال کرتے پر ماں جی ویسی کی ویسی ہی ہیں بجائے اس کے کہ طبعیت سنبھلتی ،اور بگاڑ پیدا ہو رہا ہے۔ وید جی اپنی ہٹی میں پاوں پسارے بیٹھے تھے اور ایک لونڈے کی نبض پر ہاتھ رکھے اسے گھور رہے تھے۔ اس سے فارغ ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ " اب کیا حال ہے۔ اس کا؟

"حال کیا ہونا تھا، ابھی تک زندہ ہے۔" آشا منہ بگاڑ کے بولی

" کیا مطلب!!" وید جی حیران ہوئے-

" مطلب یہ ہے وید جی کہ آپ کی دوائیں کھانے کے باوجود وہ ---------"

"دیکھ آشا کی بچی ! ایسی شوخی مت کیا

کر"

"شوخی کی بات نہیں ہے وید جی۔ ماں بیمار سے بیمار ہوتی جارہی ہے۔لگتا ہے آپکی دوا اپنا اثر آپ کے پاس ہی چھوڑ جاتی ہے"!

وید جی نے کڑوا سا منہ بنالیا-"بڑی لمبی زبان ہے تیری"

"سوتو ہے" آشا چہک کر بولی-"وید جی رام بھی یہی کہا کرتا تھا۔ہاں۔۔"

" اب بھول بھی جا رامو کو۔ " وید جی چشموں کے اوپر سے دیکھتے ہوئے بولے۔

" ہوں۔۔۔بھول جا۔۔آپ دوا داروکرو وید جی! کوئی کسی کو بھولے یا یاد کرے آپ کو اس سے کیا لینا دینا."

"ہوں" وید جی نے چند بے اثر دواؤں کی پڑیاں باندھ کر اسے تھمادیں اور چلتا کیا۔ معاوضے کے طور پر وہ دور تک چلتی آشا کے مٹکتے کولہے دیکھتا رہا۔

ماں کی بیماری بڑھتی جارہی تھی۔ اصل روگ تو بیٹے کا تھا اسی کے ساتھ بوڑھے جسم میں کئی بیماریاں آن بسی تھیں۔ لگنے لگا تھا کہ رام کی بوڑھی ماں کے دن قریب آگئے ہیں۔ آشا کا واحد سہارا گویا ٹوٹنے کی فکر میں تھا۔ پھر جب وہ رام کی بوڑھی ماں کی جی جان سے سیوا کرتی تو اسے بڑا ہی سکھ ملتا۔ایسے لگتا جیسے رام سامنے کھڑا سب کچھ دیکھ رہا ہے-اور مسکرا کر کہہ رہا ہو "واہ ری! تم نے تو ماں کو میری یاد بھی بھلا دی، بڑی چالباز ہے تو " اور آشا شرما کر اپنے پاؤں دیکھنے لگتی، جن کا بھاری ہونا سپنا لگتا تھا۔

"ماں تو ٹھیک ہو جائے گی۔ بالکل صحت مند، رام بھی لوٹ آئے گا، ہاں ماں سب ٹھیک ہو جائے گا، بھگوان ہماری ضرور سنے گا-" بھیگی آنکھوں کے ساتھ وہ ماں کو دلاسے دیتی۔ پر من شانت نہیں تھا۔ ایسے لگتا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔

مندر میں اداس کھڑی تھی - ہاتھ جوڑے بھگوان کی مورتی کو گھور رہی تھی۔ میری ماں تو شاید تھی ہی نہیں۔ باپ تھا تیرا ہی سیوک، تو نے اسے بھی چھین لیا، پھر رام کو بھی مجھ سے چھپا لیا۔ اور اگر اب اس کی ماں چھن گئی تو میں تیرا۔۔"

"ایک گرم گرم ہاتھ اس کے سر پر آن ٹکا" کیا بات ہے بچے؟ رو کیوں رہی ہے "؟

یہ مندر کے نئے پجاری جی تھے۔ آشا کھل کے رو پڑی " پجاری جی میری ماں" وہ ہچکیاں بھرنے لگی۔

" کیا ہوا تیری ماں کو۔۔۔ ہیں؟"

"-وہ بیمار ہے۔"

"تو ٹھیک ہو جائے گی۔ٹھیک ہو جائے گی۔"

"سچ پجاری جی" پہلی بار آشا نے پجاری جی کو آنکھ بھر کر دیکھا۔ جن کے چہرے پر سکون تھا، تسلی تھی، اسکا باپ جب مرا تو اسی عمر کا تھا-"سچ پجاری جی"

"ہاں بچے - رام بڑا دیالو ہے۔ کیا روگ ہے تیری ماں کو۔"

" وہ سخت بیمار ہے وید جی کہتے ہیں وہ بچے گی نہیں پجاری جی۔۔۔وہ نہ رہی تو ہمیں بھی"

" شانتی، شانتی بچے شانتی، ایسا بول نہ بولنا جو بھگوان کو برا لگے۔ ہم تمارے لیے عمل کریں گے۔ تمہاری ماں بھلی چنگی ہو جائے گی"

"سچ پجاری جی" آشا ایک ننھی منی بچی کی طرح خوش ہوگئی

" ہاں بچے۔۔۔ بھگوان کو تمہاری یہ حالت دیکھ کر ترس آگیا اور اس نے ہمارے من میں یہ بٹھایا ہے کہ ہم تمہارے لئے کچھ کریں۔"

" کرپا ہے آپکی مہاراج " آشا نے ہاتھ جوڑ کر سر جھکالیا.

"میں گندا کیڑا ہوں-" پجاری گرج کر بولے پھر مورتی کی طرف اشارہ کر کے کہا" مہا بھی وہ ہے اور راج بھی اسی کا ہے، اب تو جا -- اور ہاں شام کو دو ناریل دے جانا"

"ہاں کیوں نہیں ضرور لاوں گی مہاراج" نامراد لوگوں کے طرز فکر میں ایک انتہا پسندی سی آجاتی ہے۔ اگر نہیں ہے تو بھگوان ہی نہیں۔ اور اگر ہے تو ایک مدھم سی آس بھی بہت کچھ ہے۔ پجاری جی نے آس دلائی-آشا کی بے کل آتما کے لئے یہ سہارا بھی بہت تھا۔

وہ مندر سے باہر نکلی تو اسکے دل میں ایک سکون سا تھا۔اس نے سوچا بھگوان باہر سے کیسا بھی لگے، اندر سے بڑا ہی سندر ہے۔ گھر لوٹی تو وہاں قیامت آئی ہوئی تھی۔ بربادی اسکا انتظار کر رہی تھی - ایک ہجوم تھا۔ اسے دیکھتے ہی سب پیچھے ہٹ گئے۔ رامو کی بوڑھی ماں بے جان پڑی تھی۔ آشا نے کھاٹ کے پائے پر سر مار کر پھوڑ لیا کہ پھوٹے نصیبے کا کوئی نشان تو ہو-شمشان گھاٹ سے اٹھنے والے دھویں نے اس کی دنیا مکمل طور پر تاریک کردی، من کی دنیا اجڑ گئی، اور تن کے پھول مرجھا گئے۔

اب وہ کسی راہ پر چلے؟۔کوئی باقی نہیں رہا جو اسے اپنا سمجھتا ہو- یا جسے یہ اپنا سمجھے۔ آتما ہتیا میں ہی مکتی نظر آئی۔ آتما ہتیا کے بارے میں سوچتے ہی اسے کچھ سکون سا محسوس ہوا۔ٹھیک ہے۔ اب ٹھیک ہے۔ بدشکل بھگوان کی دی ہوئی زندگی اس کے منہ پر دے ماری جائے، اس سے اچھا بدلہ اور کیا ہوگا۔ آج رات آخری رات ہوگی آشا نے سوچا۔ ایک آدھ کوس دور گہری کھائیاں تھیں، انکے پیچھے دریا، بس وہیں سے کود جاؤں گی۔ آدھی رات کو یہ دبے پاوں نکل کھڑی ہوئی۔ گاؤں بے جان پڑا تھا- پاؤں منزل کا راستہ جانتے تھے ،چل پڑے۔ اندھیرا اسے روشنی کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ پر یہ کیا؟۔ راستے میں مندر پڑتا تھا۔۔ پڑتا ہے تو پڑا کرے میں کترا کر گزر جاؤں گی- پر یہ محض سوچ تھی، جب پاس پہنچی تو غصے سے بے قابو ہوگئی۔ ذرا دیکھوں تو۔ وہ اندر آئی۔ مورتی کے پاس ایک دیا ٹمٹما رہا تھا۔اسکی مدھم لو میں مورتی کی ہیئت اور بدشکلی اور بڑھ گئی تھی۔ آشا اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی -نفرت اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ " ہوں بھگوان۔۔۔ تو بھگوان نہیں۔۔۔۔تھو" اس نے مورتی پر تھوک دیا۔" تو ڈھونگ ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑائی اور پھر چیخ کر بولی "ہاں

ہاں تو ڈھونگ ہے" خاموشی میں آواز گونج گئی۔لیکن اس سے آشا جس جوش میں تھی، اسے احساس نہ ہوا-تھوڑی دیر کھڑا رہنے کے بعد وہ گھومی تا کہ منزل کی طرف روانہ ہو۔ سامنے پجاری جی کھڑے تھے۔ اسے سایہ سا نظر آیا، پر یہ جان گئی کہ یہ وہی ہیں۔ اسے پجاری جی کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا، کیونکہ مورتی کے پاس جلنے والے دیئے اور پجاری جی کے درمیان یہ خود کھڑی تھی۔ وہ ہٹ کر چلنے لگی۔ ایک لمحے کو اس نے دیکھا کہ دیے کی مدھم لو پجاری جی کے چہرے پر پڑی، وہاں بھی اسے مورتی جیسے نقوش نظر آئے۔ وہ گھبرائی - اور تیز تیز قدموں سے باھر نکل آئی "رک جاو" پجاری جی کی آواز بے اثر رہی۔ اور آشا آگے کی طرف بڑھ گئی۔ چاند اٹھ آیا تھا، ہلکی ہلکی چاندنی میں وہ کچھ دیکھتی، کچھ نہ دیکھتی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ پتھروں کے چھوٹے سے سلسلے میں سے گزرنے کے بعد سامنے پیڑوں کے جھنڈ تھے۔ پہلے وہ رات کے وقت پیڑوں کے جھنڈ کا تصور کر کے ہی کانپ جایا کرتی تھی۔ پر آج اس نے ان گھنے پیڑوں کو بے دھڑک عبور کرلیا۔ آگے ڈھلوانی میدان تھا۔ اسی میدان کے خاتمے پر گہری کھائیاں تھیں میدان میں داخل ہوتے ہی اس کے قدم تیز ہو گئے۔ منزل سامنے نظر آرہی تھی۔ میدان میں داخل ہو کر وہ تھوڑی دور ہی گئی ہوگی کہ ٹھٹھک کر رک گئی۔ کسی نے اسے آواز دی تھی۔

"رک جاؤ" وہ کانپ گئی۔ آواز پجاری جی کی تھی۔ اس نے گھوم کر دیکھا پجاری جی اسکے سر پر کھڑے تھے۔ وہ آگے بڑھے اور اسے دونوں شانوں سے پکڑ لیا۔'' کہاں جارہی ہو۔۔۔ بولو"

آشا کچھ دیر بے سدھ کھڑی رہی پھر بولی "مرنے"

" آتما ہتیا پاپ ہے- مہا پاپ" پجاری جی سرگوشی کے انداز میں بولے۔

" بھگوان کا دیا ہوا جسم اس کے منہ پر دے مارنا ثواب ہے۔۔۔ میں وہی کرنے جا رہی ہوں" آشا کے بولوں میں سختی آمیز روانی تھی- پجاری جی نے اسے جھنجھوڑا "ہوش کرو"

"میری ماں مرگئی، میری ماں مرگئی، سب کچھ چھین لیا تمہارے بھگوان نے سب کچھ"۔ آشا سسکیاں بھرنے لگی۔ "سنو پجاری جی- بھگوان اس کے مندر سب دھوکا ہے، فریب ہے، وہاں کچھ بھی نہیں، وہاں بھگوان نہیں، شیطان رہتا ہے اور تم لوگ۔۔۔ ہاں تم لوگ اس کے موالی ہو"

"ہوش کرو" پجاری جی پھر بولے۔

"ہاں ہاں اگر وہاں بھگوان ہوتا تو میری ضرور سن لینا-لیکن وہ نہیں ہے کہیں بھی نہیں ہے۔ یہ تم لوگ ہو جو مورتیوں کی اوٹ میں راج کرتے ہو"

ہوش کرو بچے - " پجاری جی نے اپنی گرفت مضبوط کردی۔

" مجھے چھوڑ دو " آشا چیخی " تمہارا بھگوان راکشش ہے۔ اور تم اس کے موالی ہو۔ وہ لوگوں کی زندگیوں سے کھیلتا ہے۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں اس کے منہ پر طمانچہ ماروں گی۔۔۔ مجھے"

پجاری جی نے اپنا مضبوط ہاتھ اسکے منہ پر رکھ دیا۔ پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولنے لگے۔ " تمہیں بھگوان سے انتقام لینا ہے، اسے دکھ دینا ہے، جس نے تجھے جیون دیا، وہ رشتے دیئے جن کے ٹوٹنے پر تم یہ سب کچھ کر رہی ہو- جس بھگوان نے تم سے تمہاری ماں چھینی، اسی نے تمہاری ماں کو جیون دیا تھا یہ دنیا کا دستور ہے، لوگ آتے ہیں، چلے جاتے ہیں، پیچھے والے بھی مرنے لگیں تو دنیا خالی ہو جائے. میرا کوئی بھی نہیں، پھر بھی زندہ ہوں۔ اور بھگوان کے چرنوں میں پڑا ہوں۔"

آشا کا سر گھومنے لگا۔۔۔ باتیں اس کے گرد چکر لگا رہی تھیں۔ پجاری جی نے بات جاری رکھی۔ "بھگوان نے جو کچھ کیا وہ تمہیں برا لگا۔۔۔ پر جو کچھ وہ کرنے والا ہے وہ ہوسکتا ہے برا نہ ہو۔۔۔ بے وقوف لڑکی کیوں اپنی جان دیتی ہے۔ تم نے ابھی زندگی میں پایا ہی کیا ہے جس کے کھونے نے تجھے آپے سے باہر کردیا۔"

آشا نے پجاری جی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ چاند کی مدھم روشنی میں اسے اپنا باپ نظر آیا۔ وہ اس کے ساتھ لپٹ کر رونے لگی۔

"رونا نہیں۔نا۔۔۔نا۔۔۔ اپنے حصے کا رونا تم رو چکی، اب اپنے حصے کی خوشیاں سمیٹنے کے لئے تیار ہو جاؤ" پجاری جی کی باتوں نے اجڑی نگری میں چہل پہل کے آثار پیدا کر دیے تھے۔ آشا نے محسوس کیا جیسے بھگوان کوئی چمتکار دکھانے والا ہے۔ ناکامی اور مایوسی کی انتہاء کے بعد سکھ چین کا زمانہ آنے والا ہو- ایک موہوم سا خیال اس کے من میں آیا۔ کیا پتہ گھر جاؤں تو سامنے رام بیٹھا ہو۔ وہ جسم ڈھیلا چھوڑ کر پجاری جی کے ساتھ چل پڑی۔ اس کی آنکھیں نمدار تھیں، پر دماغ نے سوچنا چھوڑ دیا تھا اس لئے وہ کوئی سوال نہ کرسکی۔

پجاری جی دھیرے دھیرے بول رہے تھے " بھگوان بے رحم اور ظالم نہیں ہوتے۔ وہ اپنے بندوں کا امتحان لیتے ہیں۔ جو جتنا زیادہ مہان ہوگا اس کا اتنا ہی کڑا امتحان ہوگا یہ تو ریت ہے، ایسا ہوتا آیا ہے۔ تم ایک امتحان سے گزری ہو، برا وقت کٹ گیا، اب بہار آنے والی ہے اور تم ہو کہ.."

چاند کی مدھم لو تلے دونوں چلے آرہے تھے۔ آشا کے دماغ نے سوچنا شروع کیا- بھگوان سے ٹکر لینا انسان کے بس میں نہیں، وہ مہان ہے، دیالو ہے، ہم سب کا ودھاتا ہے، اس کا حق ہے کہ وہ ہمارے ساتھ کھیل کرے اور یہ مورتیاں بدشکل نہیں ہوتیں یہ ہمارے اپنے کرم ہیں جو ہمیں نظر آتے ہیں اچھے یا برے - میں کیا کرنے جارہی تھی۔ بھگوان، یہ اس کے سیوک، سب کتنے مہان ہیں جنہیں میں غنڈے موالی کہہ رہی تھی۔ وہ تو دیونا نکلے بھگوان شما کردے"

پجاری جی درختوں کے جھنڈ کے پاس جا کر رک گئے۔ یہ بھی رک گئی۔ پجاری جی بولے " تھک گئی ہو، ذرا دم لے لو۔۔۔ ہاں بیٹھ جاؤ"

آشا کو اپنا باپ یاد آ گیا وہ بیٹھ گئی - پجاری جی نہ بیٹھے۔ وہ ٹہلنے لگے۔ زمین پر بکھرے سوکھے پتے انکے پیروں تلے کچلے جا رہے تھے۔ ان کی چرر چرر بڑی بھیانک معلوم ہوتی تھی۔ پجاری جی پھر بڑبڑائے۔۔" جیون اتنا سستا ،اتنا برا نہیں کہ اسے یوں گنوا دیا جائے۔۔۔"

آشا اکڑوں بیٹھی تھی۔تھوڑی دیر بے چینی سے ٹہلنے کے بعد پجاری جی اس کے پاس بیٹھ گئے۔۔ مکمل خاموشی تھی۔۔۔ پھر گہری کھائیوں سے آواز ابھری۔۔۔"تم تھک گئی ہو۔۔۔آرام کر لو۔۔۔ہاں لیٹ جاو۔۔۔یوں" انہوں نے اس کے منہ پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھ دیا۔سوکھے پتے ایک بہت ہی بڑے بوجھ تلے کچلے گئے۔خاموشی نے دم توڑ دیا اور آشا بے ہوش ہوگئی۔۔۔ پر ہوا کیا ؟ بھگوان نے من کی دنیا اجاڑی تھی ، اس کے موالی نے تن کی نگری لوٹ لی۔پجاری جی فارغ ہوئے ، کپڑے درست کئے ، دیکھا چاند ڈھل گیا تھا ،اور وہ اندھیرا چھا گیا تھا جس کے بعد صبح کے آثار نمودار ہوا کرتے ہیں - انہیں فکر ہوئی۔ کچھ دیر سوچا ، پھر نہایت اطمینان سے آشا کے ڈھیلے اور بے سدھ شریر کو کندھے پر ڈال کر کھائیوں کی طرف چل پڑے۔ تھوڑا چلنے سے ہی ان کا سانس پھول گیا۔ رک گئے۔ سانس درست ہوا ،پھر چل پڑے۔اسی طرح رکتے چلتے وہ ان گہری کھائیوں کے کنارے جا پہنچے ، جن کے نیچے دریا بہتا تھا۔انہوں نے آشا کو کھائی کے کنارے لٹا دیا اور کھڑے ہو کر سانس درست کرنے لگے۔ایسے لگتا تھا جیسے پجاری جی میلوں دوڑ کر آئے ہوں۔ اسی اثناء میں آشا کے بدن میں حرکت پیدا ہوگئی۔ " اوں"-مریل سی آواز نے پجاری جی کو چونکا دیا۔انہوں نے تیزی سے آشا کی طرف دیکھا ، کچھ کچھ سویرا چڑھ آیا تھا " آہ" ایک اور آواز آئی - آشا نے دھیرے دھیرے اپنی کوری آنکھیں کھولیں اس نے دیکھا شیطان اس پر جھکا ہوا ہے۔پھر شیطان نے اسے زور سے دھکا دیا۔اس نے محسوس کیا کہ اس کا جسم لڑھکتا ہوا نیچے بہت نیچے جا رہا ہے۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا ،کوئی دھماکہ یا کچھ اور۔ پھر ایسے لگا جیسے وہ اوپر بہت ہی اوپر جا رہی ہو ،ہلکی پھلکی سبک ،اب اسے کوئی دکھ نہ رہا تھا۔

صبح سویرے منہ اندھیرے چند بڑے بوڑھوں نے دیکھا کہ نئے پجاری جی جنگل کی طرف سے آ رہے ہیں۔ تھکے تھکے سے ، ساری رات کے جاگے ہوئے۔سب نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا - پجاری جی منہ سے کچھ نہ بولے۔بس ذرا سا رک کر ہاتھ جوڑے ،اور سر کو جھکا دیا ،ایسے لگا جیسے منہ میں کچھ پڑھ رہے ہیں۔پجاری جی چلتے گئے اور لوگ احتراماً کھڑے رہے۔

"بڑے پہنچے ہوئے پجاری جی ہیں ،لگتا ہے ساری رات تپسیا میں گزار دی۔"

گر تم مجھے پہچان لو

نسترن احسن فتیحی

میں خدا کی تخلیق کردہ
اک ایسی نظم ہوں
جس کی نغمگی اور ترنم
روح کے تاروں
میں رواں دواں
تمہاری فکر کے
پاکیزہ لمس سے
جلا پائے
مگر تم
جسم کے جنگل
میں الجھ کر
حیوان بن گئے ہو
اور روح کے آہنگ
سے محروم رہ کر
نہیں جانتے
کہ خدا نے اس جسم
میں ہی ملفوف کر کے
تمہیں نوازا
محبت کے الوہی سروں سے
گر تم مجھے پہچان لو
تو اس زمیں پر
مثل جنت
اپنے ہم نشیں
اک حور پاؤ
مگر یہ ممکن جبھی تھا کہ تم
اپنی روح کو پاک رکھتے
سرشار رہتے

ہمیں دُکھ دیئے ہیں

میر ساگر

ہمیں دُکھ دیئے ہیں
ہَواؤں کی بے چین تیز بَستگی نے
اُداسی نے
لہروں کی بے پایگی نے
ہوا، بادباں، ڈولتی کشتیوں نے
چراغوں کی لو نے
بَھڑکتے دِیوں نے
ہمیں دُکھ دیئے ہیں
ہَمیں دُکھ دیئے ہیں
دَریچوں، دَروں نے
بَڑی راہ داری نے
بُرجوں، گھروں نے
حَریری سے پَردوں کی ناختم ہوتی ہوئی
سِلوٹوں نے
تعاقب میں بھٹکی ہوئی روشنی نے
سِتاروں سے اُلجھی ہوئی اُنگلیوں نے
تَرنّم نے، لَے نے، چَمک، تیرگی نے
ہَمیں دُکھ دیئے ہیں
ہَمیں دُکھ دیا ہے دَریچے سے اک
جھانکتی پَردگی نے
اور اُس پَردگی میں شناسا ہنسی نے
ہنسی میں چھنکتی ہوئی نغمگی نے
اُداسی کے خاکوں کی بے چہرگی نے
اذانوں کی آواز نے، بانسری نے
ہمیں دُکھ دیئے ہیں